جنوری 2004

ماہنامہ

اردو دنیا

نئی دہلی

پیہم مرجِ امکانی میں
اگلا پاؤں نئے پانی میں
بانی

قومی اردو کونسل کی طرف سے قارئین کو

نیا سال مبارک

دیوآنند کو دادا صاحب پھالکے ایوارڈ

قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، نئی دہلی
محکمہ ثانوی و اعلا تعلیم، وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

پروفیسر گوپی چند نارنگ کو دوبارہ قومی اردو کونسل کا وائس چیئرمین نامزد کیے جانے پر 9/دسمبر 2003 کو کونسل کے کمیٹی روم میں ان کا استقبال کیا گیا۔
اس موقعے پر لی گئی ایک یادگار تصویر میں پروفیسر گوپی چند نارنگ، قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ، ڈاکٹر آر. کے. بھٹ، پرنسپل پبلیکیشن آفیسر اور جناب مخمور سعیدی۔

قومی اردو کونسل کی شائع کردہ ''دیوانِ اشرف علی خاں فغاں'' مرتبہ۔ سرور الہدیٰ کا اجرا 19/نومبر 2003 کو جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے اسکول آف لینگویج لٹریچر اینڈ کلچر اسٹڈیز کے کمیٹی روم میں
بدستِ پروفیسر شمیم حنفی عمل میں آیا۔ اس تقریب کی صدارت ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ، ڈائرکٹر قومی اردو کونسل نے کی۔ اس موقعے پر (دائیں سے) جناب مخمور سعیدی، پروفیسر نیجر پانڈے،
پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی، ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ، پروفیسر نثار احمد فاروقی، پروفیسر شمیم حنفی اور ڈاکٹر اسلم پرویز۔

ماہ نامہ
اردو دُنیا نئی دہلی

جلد۔6، شمارہ۔1 جنوری 2004

مدیر: ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ

معاون مدیر: ارجمند آرا

ناشر اور طابع:
ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمۂ ثانوی و اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

کمپوزنگ: قومی اُردو کونسل

مطبع: جے کے آفسیٹ پرنٹرس، جامع مسجد، دہلی 6

مقام اشاعت: دفتر قومی اُردو کونسل

قیمت -/10 روپے، سالانہ -/100 روپے

چیک یا ڈرافٹ NCPUL کے نام روانہ کریں۔

صدر دفتر:
ویسٹ بلاک۔1، ونگ-6
آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی - 066 110
فون: 26103381, 26103938
فیکس: 26179657، 26108159
ویب سائٹ:
http://www.urducouncil.nic.in
email: urducoun@ndf.vsnl.net.in

شعبۂ فروخت:
ویسٹ بلاک-8، ونگ-7،
آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔ 110066
فون: 26109746

شاخ: 5-4-4/435/20، گرین ہاؤس،
اسٹیشن روڈ، نام پلی، حیدرآباد (A.P.)500001
فون: 24615139

اس شمارے میں

Council for Promotion of Urdu ... New Delhi
ACC No. 5176/F8
15/10/08
2010

آپ کی بات 2
ہماری بات .... اداریہ 5
● تمدنوں کے درمیان گفتگو اور نیا ہزارہ (گیسٹ کالم) .... سید محمد خاتمی 6
● میں نے ایوارڈ کے متعلق کبھی نہیں سوچا — دیو آنند (انٹرویو) .... سبھاش کے جھا 10
● ہندستان اور قدیم عرب مؤرخین .... نثار احمد فاروقی 11
● مشترکہ تہذیب کے علم بردار — تیج بہادر سپرو .... عبدالستار دلوی 17
● اتر پردیش میں اردو کی صورتِ حال — تاریخی پس منظر میں .... سدھا پائی 19
● اردو کے حوالے سے چند معروضات .... ارجمند آرا 23
● اردو کو قومی تعلیم میں اس کا جائز مقام دلانے کی مہم .... اپیل 25
● درسی کتب اور ادبِ اطفال .... عبدالرحمان مومن 28
● بچوں کے لیے قومی کمیشن کی تشکیل .... دیچوش مجمدار 30
● کان کُن مذاکرات اور زراعت .... بھرت جھن جھن والا 31
گوشۂ ادب:
● جی آیا صاحب (''آتش پارے'' سے ماخوذ) .... سعادت حسن منٹو 33
● مہابھارت کی روایت اور اردو افسانہ .... سلام بن رزاق 37
● جیلانی بانو سے گفتگو .... مشرف علی 41
گوشۂ فروغِ کتب
● مثنوی — تعارف، ارتقا اور تدریس
(''اردو اصناف (نظم و نثر) کی تدریس'' سے اقتباس) .... منور زمانی 45
● لاطینی زبان و ادب (''جامع اردو انسائیکلوپیڈیا'' سے اقتباس) .... حکیم سید محمد حسان نگرامی 51
طلبہ کے لیے
● آرمی میں بہ حیثیت مذہبی استاد کیریئر (کیریئر گائیڈنس) .... سلمان عابد 55
● انٹرنیٹ گائیڈ .... نعیم احسن 57
● تعلیم (کوئز) .... صلاح الدین 60
● بڑھتے قدم (کمپیوٹر سینٹر کے فارغ طلبہ کے انٹرویو-6) .... محمد سہیم الدین 64
اردو خبرنامہ .... ادارہ 65
تبصرہ و تعارف .... کتابوں پر تبصرے 74
● کلیاتِ پریم چند (جلد 4)/مرتب: مدن گوپال .... مبصر: علاء الدین خاں
● زبان اور قواعد/رشید حسن خاں .... مبصر: ریاض الدین
● دھوپ چولھا/ایم. ایم. ہدیٰ .... مبصر: ایس. اے. رحمٰن
● شہر آشوب/اقبال متین .... مبصر: قمر رئیس
● اردو اخبارات و جرائد کی ڈائرکٹری (انگریزی میں)/مودود علی صدیقی .... مبصر: اطہر فاروقی
بچوں کا گوشہ
● کچھ ہندستانی چڑیاں .... این. این. مجمدار 78

آپ کی بات

■ **عبدالعلیم قدوائی، زاہد منزل، 4/873، نئی فرینڈس کالونی، علی گڑھ**

ہر ماہ ''اردو دنیا'' سے اردو کونسل کی مختلف النوع اور مفید سرگرمیوں کا حال معلوم ہوتا رہتا ہے۔ اردو زبان کی خوش نصیبی ہے کہ اس وقت اسے آپ کی شکل میں اللہ تعالیٰ نے ایک مخلص اور فعال شخصیت عطا کر دی ہے۔

''اردو دنیا'' کا ہر شمارہ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ نومبر کے شمارے میں جناب رشید حسن خاں کا مضمون خاص طور پر مفید اور کارآمد ہے۔ ادبی کوئز، مجتبیٰ حسین صاحب سے انٹرویو اور انٹرنیٹ گائیڈ بھی قابلِ ذکر ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کی ہمت اور خلوص میں مزید برکت عطا فرمائے۔

■ **شبنم جہاں، منور علی، شعبۂ اردو، ڈی.سی.ایس. کے پوسٹ گریجویٹ کالج، مئوناتھ بھنجن، یوپی**

''اردو دنیا'' پابندی سے موصول ہو رہا ہے۔ یہ رسالہ مجھے جہانِ اردو سے جوڑے رکھتا ہے۔ ''اردو دنیا'' سے قومی اور بین الاقوامی اردو آبادی کی خبریں گھر بیٹھے مل جاتی ہیں۔ میں اردو زبان کو سبھی زبانوں سے بلند درجہ دیتی ہوں کیونکہ اردو ایک ایسی زبان ہے جو آسان بھی ہے، خوبصورت بھی اور سبھی کو اچھی لگنے والی بھی۔ میں اس زبان کی ایک ادنیٰ خادم ہوں اور میری ہمیشہ یہ کوشش ہوتی ہے کہ اردو کی ترقی کے لیے کچھ کروں اور میں اپنی حیثیت اور حوصلے کے مطابق اردو کو اس کا جائز حق دلانے کے لیے کوشاں رہتی ہوں۔ وہ طلبہ اور طالبات جن کی مادری زبان اردو ہے، انھیں ترغیب دینی چاہیے کہ وہ اردو ذریعۂ تعلیم کو اپنائیں اور مقابلہ جاتی امتحانات میں کامیابی حاصل کرکے اپنا اور ملک کا نام روشن کریں۔ میں جانتی ہوں کہ آپ اس سلسلے میں کافی کام کر چکے ہیں، کر رہے ہیں اور آگے کرنے کا حوصلہ بھی رکھتے ہیں۔

■ **حال ہی میں قومی اردو کونسل کی تشکیلِ نو ہوئی ہے۔ اس سلسلے میں نومنتخب اراکین کے خطوط قارئینِ ''اردو دنیا'' کی نذر ہیں۔**

■ **ڈاکٹر رفیق ذکریا، 3، بی لینڈ، کف پریڈ، ممبئی-400003**

قومی اردو کونسل کی مجلسِ عام اور ایگزیکٹیو بورڈ کے رکن کے طور پر نامزدگی کی اطلاع دینے کے لیے میں آپ کا شکر گزار ہوں۔

عالی جناب مرلی منوہر جوشی کی قیادت میں کام کرنا میرے لیے باعثِ فخر و مسرت ہے۔ انھوں نے فروغِ اردو کے کاز کو ایک نیا رخ عطا کیا ہے اور اسے مایوسی اور کس مپرسی کی اس فضا سے باہر نکالنے میں بھرپور مدد کی ہے جس کی یہ ایک عرصے سے شکار تھی۔ وہ اردو کے لیے جس کھلے دل سے کام کر رہے ہیں اس سے میں ذاتی طور پر بے حد متاثر ہوں۔ ان تک میرا شکریہ پہنچا دیجیے۔

آپ نے جس محنت اور لگن کے ساتھ کونسل میں نئی روح پھونک دی ہے اور کلاسیکی ادب کے ساتھ ساتھ درسی کتب کی اشاعت کے علاوہ اردو داں نوجوانوں کے لیے روزگار فراہم کرانے کی غرض سے کمپیوٹر سینٹر کھول کر انھیں آپ روزگار مرکوز تربیت دے رہے ہیں، اس کے لیے آپ شکریے کے مستحق ہیں۔

■ **پروفیسر ادے نارائن سنگھ، ڈائرکٹر، سینٹرل انسٹی ٹیوٹ آف انڈین لینگویجز، میسور**

قومی اردو کونسل کی تشکیلِ نو مجلسِ عاملہ میں میری نامزدگی کی اطلاع کے لیے شکریہ۔ اس بار بھی بہت اہم لوگوں کو کونسل کی مجلسِ عاملہ میں نامزد کیا گیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کی سربراہی میں کونسل مضبوط سے مضبوط تر ہوگی۔

■ **سید اقبال علی، پرنسپل، یونیورسٹی پالیٹکنک علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ**

محترمہ انیتا مہاجن کا تحریر کردہ مضمون ''سرسید احمد خاں'' (''ہمارے رہنما'' جلد-9 سے اقتباس) ماہنامہ ''اردو دنیا'' کے ماہ اکتوبر 2003 کے شمارے میں نظر نواز ہوا۔ مضمون واقعی بہت معلوماتی اور مفید ہے اور سرسید کی زندگی کے مختلف گوشوں کو اُجاگر کرتا ہے۔ اس معلوماتی تحریر کے لیے جہاں محترمہ انیتا مہاجن قابلِ مبارکباد ہیں، وہیں اس کی اشاعت کے لیے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان قابلِ ستائش ہے۔

■ **ڈاکٹر حیات افتخار، صدر شعبۂ اردو، قائدِ ملت کالج، میداوکم، چنئی**

''اردو دنیا'' کے نومبر 2003 کے شمارے میں ''تملناڈو میں اردو تعلیم کی صورتِ حال'' کے عنوان سے میرے مقالے کی اشاعت کے لیے شکریہ۔ میں نے دراصل اپنے مقالے کا عنوان ''تملناڈو کے کالجوں میں اردو تعلیم کی صورتِ حال'' لکھا تھا اور اس میں تملناڈو کے کالجوں میں اردو تعلیم کی موجودہ حالت اور اس کے نئے مسائل کا احاطہ کرنے کی سعی کی تھی۔ عنوان کی تبدیلی سے یہ غلط فہمی پیدا ہونے کا امکان ہے کہ اس مقالے کا موضوع اسکول کی سطح پر تعلیمی مسائل کا جائزہ بھی ہے جبکہ ایسا نہیں ہے۔

میں نے اپنے مختصر سے مقالے میں ریاستِ تملناڈو کے اکثر و بیشتر کالجوں میں اردو اساتذہ کو آج کل جس صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے اس کی طرف اشارہ کیا تھا۔ چونکہ موضوع کالجوں سے متعلق تھا اس لیے اسکول کی سطح پر اردو تعلیم کی صورتِ حال بیان کرنے کا کوئی محل نہیں تھا۔ ایسا نہیں ہے کہ یہاں اردو میڈیم اسکول سرے سے نہیں ہیں۔ ایک نہیں کئی ہیں، لیکن ان کا وجود برائے نام رہ گیا ہے۔ اکثر و بیشتر اسکولوں میں اردو میڈیم

میں داخلہ لینے والوں کی تعداد محدود ہوتی ہے اور جو یہاں سے فارغ ہوتے ہیں، ان کی بہت ہی قلیل تعداد کالجوں کا رخ کرتی ہے۔ عربی مدارس سے فارغ ہونے والے طلبہ کالجوں میں ڈگری کی سطح پر داخلہ لینے کے اہل اس لیے نہیں ہوتے کہ وہ انگریزی سے نابلد ہوتے ہیں۔

مذکورہ مقالے میں بیان کردہ صورت حال سے بعض کالج مستثنیٰ ہوسکتے ہیں۔ لیکن عمومی صورت حال یہی ہے۔ چنئی اور شمالی آرکاٹ ضلع کے دو تین کالجوں کو چھوڑ کر بقیہ تمام کالجوں میں کم و بیش یہی صورت حال ہے۔

میں نے اپنے مضمون میں تملناڈو کے کالجوں کے نام بھی دیے تھے، ان میں تین نام اور رہ گئے ہیں۔ سرکاری کالج، گورنمنٹ آرٹس کالج، کرشنا گری کے علاوہ سرکاری امداد یافتہ کالجوں میں جمال محمد کالج، تروچی اور وقف بورڈ کالج، مدورے ہیں۔

■ **تمنا مظفر پوری، جمیل کمپاؤنڈ، سمن پورہ، بی.وی.کالج، پٹنہ -800014**

''اردو دنیا'' نومبر کا شمارہ ملا۔ ''اردو دنیا'' میں شامل مضامین دیکھ کر آپ کی محنت کا اندازہ ہوتا ہے۔ پتہ نہیں آپ کس طرح اتنے اچھے اور اہم مضامین حاصل کرلیتے ہیں۔ میں جب گیا سے ماہنامہ ''اطفال'' نکالتا تھا تو مضامین کی پریشانی تھی، لوگوں کو خطوط لکھ کر منگوایا کرتا تھا۔

اس شمارے میں جناب ارشد عالم کا مضمون ''مدارس کو سمجھنے کی ضرورت''، ''تکنیک پر مبنی تعلیم''، ''اردو صحافت اور خواتین سے متعلق تحریریں'' (سیدہ روبینہ تسنیم قادری) ''علاج بالتدبیر'' (حکیم اشہر قدیر) اور گوشۂ ادب میں ایڈورڈ سعید پر مضمون، مجتبیٰ حسین کا انٹرویو، عید سعید کے موقع پر نظیر اکبرآبادی کی نظم کی شمولیت برمحل ہے۔ سبھی مضامین پڑھے، اچھا لگا۔ مستقل عنوانات کے تحت آپ اتنے مضامین شامل کرلیتے ہیں۔ یہ کمال آپ کو حاصل ہے خصوصاً کوئز کا ہر ماہ شامل ہونا۔

خدا کرے آپ کی یہ محنت اردو زبان کے شاندار مستقبل کا پیش خیمہ ہو۔

■ **پروفیسر محمد حلیم خاں، چیئرمین مدھیہ پردیش مدرسہ بورڈ بھوپال، وزیر تعلیم، حکومت مدھیہ پردیش۔**

آپ کا مراسلہ موصول ہوا جس میں آں محترم کی نوازش سے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی مجلس عاملہ میں راقم کی حکومت کی طرف سے نامزدگی کی اطلاع ملی، ساتھ ہی سرکاری حکم نامے کی نقل بھی۔

جناب والا! آپ نے راقم کو اس نامزدگی پر جو مبارک باد پیش کی ہے اس کے لیے شکریہ۔

■ **شکیل احمد، ڈپٹی رجسٹرار، کوآپریٹو ڈپارٹمنٹ معرفت محترمہ شاہین خاں لائبریرین راجستھان ٹیکسٹ بورڈ، کربھون ٹوڈرمل مارگ، اجمیر**

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی مجلس عاملہ کا ممبر نامزد کیے جانے کے لیے میں آپ کا ذاتی طور پر بے حد شکرگزار ہوں۔ آپ نے جو ذمے داری سونپی ہے انشاء اللہ اس کو پورا کرنے کی بھرپور کوشش کروں گا اور حتی الامکان اردو کے فروغ کی سعی کرتا رہوں گا۔

■ **محمد شاہد اللہ خاں، اترپردیش اردو اکادمی 4/193، وشال کھنڈ، گومتی نگر، لکھنؤ**

آپ کا خط موصول ہوا۔ میں آپ کا اور حکومتِ ہند کا بے حد مشکور و ممنون ہوں کہ مجھے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی مجلسِ عاملہ کے لیے رکن نامزد کیا گیا ہے۔ میں اس رکنیت کو بصد خلوص قبول کرتا ہوں۔

میں اس سے وابستہ ذمے داریوں کو بخوبی انجام دیتا رہوں گا۔ عزت افزائی کے لیے میں تہہ دل سے آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

■ **سید جعفر رضا، ڈپارٹمنٹ آف اردو، یونیورسٹی آف الہ آباد**

قومی اردو کونسل کی نئی مجلسِ عاملہ میں اپنی نامزدگی کے لیے میں آپ کا مشکور ہوں۔

□□□

■ **نذیر احمد ناز، ڈگی وچہ، کشمیر**

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کو سری نگر میں کتاب میلہ منعقد کرانے پر دل کی عمیق گہرائیوں سے مبارکباد دینا چاہتا ہوں۔ دل خدشات سے پُر تھا کہ شاید میلہ کامیاب نہ ہوگا مگر خدا کا شکر ہے کہ خدشات کے برعکس ہوا۔ دو بار میں بھی میلے میں لگے کتابوں کے مختلف اسٹالوں کو دیکھنے گیا۔ کچھ خریداری بھی کی۔ اسٹالوں پر نادر کتابیں دیکھ کر محسوس ہوا کہ میلہ اگر نہ لگتا تو یہ نادر کتابیں کس کی وساطت سے قارئین تک پہنچ پاتیں۔ یہ سارا کریڈٹ آپ کو ہی جاتا ہے۔ ریڈیو کشمیر سے آپ کی زبان سے یہ سنا کہ آئندہ بھی سری نگر میں ایسے میلے لگانے کی کوشش ہوگی، دل کو کافی مسرت ہوئی۔

ستمبر کے ''اردو دنیا'' میں جگ ثریا اور وکاس سنگھ کا مضمون ''زبانوں کے بڑھتے ہوئے قبرستان'' پڑھا تو تحت الشعور میں اردو زبان کی آج کی حالت ہچکولے کھانے لگی۔ 'اباگا' زبان کے پانچ بولنے والے رہ گئے ہیں مگر یہاں اردو رسم خط کے جاننے اور لکھنے والوں کی تعداد خطرناک حد تک گھٹ رہی ہے۔ محسوس ہوتا ہے کہ بول چال کی حد تک ہی اب اردو کا مصرف رہ گیا ہے۔ اردو زبان کے خیر خواہوں کو جنگی پیمانے پر اپنی حکمت عملی اس طرح وضع کرنی ہوگی کہ نہ صرف اردو بول چال بلکہ اردو رسم خط کی بھی ترویج ہوسکے۔ اس سلسلے میں اردو کونسل تو اپنا حق ادا کررہی ہے مگر باقی ایجنسیاں جو اردو زبان سے وابستہ ہیں، ان کو بھی آپ کے ہی نقش قدم پر چلنا ہوگا تبھی کہیں اردو زبان اپنا کھویا ہوا مقام اس ملک میں پاسکتی ہے۔

■ **امتیاز احمد ندوی، جنرل سکریٹری، صدیق اکبر ایجوکیشنل اینڈ ویلفیر فاؤنڈیشن، 457، علی نگر، رائے بریلی، یوپی**

میرے لیے اور فروغ اردو سے دلچسپی رکھنے والے تمام لوگوں کے لیے آپ کے وہ اقدامات باعث مسرت ہیں جو آپ نے اردو کے سلسلے میں شروع کیے ہیں کیونکہ اس پر ملتِ اسلامیہ ہندیہ کے تشخص و بقا کا

انحصار ہے۔ میرے نزدیک تو آپ مزید شکریے کے مستحق اس لیے بھی ہیں کہ آپ نے فنکشنل عربی کا ڈپلوما کورس شروع کیا ہے جو اردو زبان کی اعلا مہارت کے لیے ناگزیر ہے۔ میں آپ کو مبارک باد دیتا ہوں اور شکریہ ادا کرتا ہوں نیز دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ سے مزید کام لے اور آپ کو ترقی نصیب فرمائے۔

■ طارق شمسی، ڈائرکٹر مسلم تعلیمی سوسائٹی، 127، پنجابیان، کٹرہ شہاب خاں، اٹاوہ، یوپی

آپ کی ہمہ جہت شخصیت نے نہ صرف اردو کونسل کو نئی سمت دی ہے بلکہ اردو داں طبقے کو بھی اپنی کرشمہ ساز شخصیت کے جادو سے متاثر کر ان کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ اس وقت اردو کو آپ جیسے باحوصلہ افراد کی ہی ضرورت ہے۔ موبائل وین، کتاب میلہ، کمپیوٹر سینٹر، عربی اسپیکنگ کورس، اردو لرننگ کورس اور ''اردو دنیا'' کے ذریعے علمی، ادبی مضامین اور اردو دنیا کی نئی خبروں کے ذریعے واقعی آپ نے جو نمایاں کام انجام دیے ہیں، وہ آپ ہی کا حصہ ہیں۔ خدائے عزوجل آپ کو مزید خدمات کے مواقع عطا فرمائے تاکہ آپ تادیر ہم نوجوانوں کے لیے مشعلِ راہ بن کر حوصلوں کو جلا بخشتے رہیں۔

■ محمد مشتاق، آر۔ پی۔ ایم۔ اسٹریٹ، گورنا ہوٹل، اونچا محلہ، پوسٹ آفس ہگلی پاڑہ، ہگلی-712125، ویسٹ بنگال

میں ''اردو دنیا'' کا سالانہ خریدار ہوں۔ واقعی ''اردو دنیا'' کو اگر کسی نے نہ پڑھا تو اس نے کوئی رسالہ ہی نہ پڑھا۔ اس میں جو کوئز رہتا ہے اس سے معلومات میں اور اضافہ ہو جاتا ہے۔ یہ بہت معلوماتی کالم ہے۔

□□□

جنوبی ہند کی تاریخ

مصنف: کے اے نیل کنٹھ

مترجم: آر کے بھاٹاگر

جنوبی ہند کی تاریخ پر بہت کم کتابیں لکھی گئی ہیں۔ کتاب میں جنوبی ہند کی قدیم تاریخ سے سترھویں صدی کے نصفِ اول تک کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

(دوسرا ایڈیشن)

صفحات: 576، قیمت: 114

دکنی نثر کا انتخاب

مرتبہ: سیدہ جعفر

دکنی نثر کا یہ انتخاب دکن میں اردو نثر کی ابتدا سے فورٹ سینٹ جارج کالج کے زمانے تک کے مصنفین کا احاطہ کرتا ہے اور ان کی تصانیف کے نمائندہ منتخبات پر مشتمل ہے۔

صفحات: 168، قیمت 45

سخنورانِ گجرات

مرتب: سید ظہیر الدین مدنی

گجرات میں اردو شعر و ادب کی نشاندہی پندرھویں صدی کے نصف آخر سے کی جاتی ہے۔ اس کتاب میں ابتدا سے 1950 تک کے شعرا کا تذکرہ اور ان کے کلام پر تبصرہ، سیاسی اور سماجی پس منظر کے ساتھ درج ہے۔

دوسرا ایڈیشن، صفحات: 340، قیمت: 77

کلیاتِ محمد قلی قطب شاہ

مرتبہ: ڈاکٹر سیدہ جعفر

گولکنڈہ کا پانچواں تاجدار محمد قلی قطب شاہ بہ یک وقت کئی اوصاف سے متصف تھا۔ اس کا ایک اہم وصف شعر گوئی بھی تھا۔ یہ اس کا مستند کلیات ہے جس میں مشکل الفاظ کی فرہنگ بھی شامل ہے۔

(دوسرا ایڈیشن)

صفحات: 824، قیمت: 157

قطب مشتری

مصنف: اسد اللہ وجہی

''قطب مشتری'' اردو کی ابتدائی طبع زاد مثنویوں میں کئی لحاظ سے بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ مثنوی متن کے ساتھ سو صفحوں پر مشتمل عالمانہ مقدمے نے کتاب کی قدر و قیمت مزید بڑھا دی ہے۔

(چوتھا ایڈیشن)

صفحات: 234، قیمت: 48

کلیاتِ سراج

سراج اورنگ آبادی

مرتب: عبدالقادر سروری

سراج اورنگ آبادی اردو کے کلاسیکل شاعروں میں ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ دیباچے میں ان کی شاعرانہ خصوصیات اور ان کے شخصی اوصاف کا بھرپور جائزہ لیا گیا ہے۔

(دوسرا ایڈیشن)

صفحات: 732، قیمت: 138

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی-110066

ہماری بات

گذشتہ دنوں بچوں کے لیے ''22 نکاتی چارٹر 04-2003'' پر راجیہ سبھا میں دو دن تک جو بحث و مباحثہ ہوا اس کے سبب ملک کی توجہ ایک بار پھر بچوں کے تعلیمی مسائل پر مرکوز ہوئی ہے۔ یہ چارٹر بچوں کی ہمہ جہتی ترقی کے لیے سرکاری منصوبوں سے متعلق ہے۔ چارٹر پر ہوئی بحث میں مختلف طبقوں کے بچوں کے درمیان پائی جانے والی تعلیمی تفریق اور دوہرے معیار کے ساتھ ساتھ، ان کے تدارک کے لیے بہت سی تجاویز سامنے آئی ہیں۔ حکومت کا یہ عندیہ بھی ظاہر ہوا ہے کہ بستوں کے مستقل بڑھتے ہوئے بوجھ کو کم کرنے کے لیے آٹھویں درجے تک امتحان لینے کا نظام ختم کر دیا جائے۔ اس سلسلے میں غور وخوض کر کے واضح حکمتِ عملی تجویز کرنے کا کام حکومت نے CBSE کو سونپا ہے۔

فروغ انسانی وسائل کے مرکزی وزیر ڈاکٹر مرلی منوہر جوشی نے بچوں کے لیے اس قومی چارٹر پر ہونے والی بحث کا جواب دیتے ہوئے اراکین پارلیمنٹ کو بتایا کہ CBSE کو تیسرے درجے تک امتحانات ختم کرنے میں کوئی عذر نہیں ہے، تاہم ضرورت اس بات کی ہے کہ پڑھائی کا بوجھ کم کرنے کے لیے آٹھویں جماعت تک امتحان نہ لیے جائیں۔ ویسے بھی اگر زیادہ نمبر لانے کو نصب العین بنا لیا جائے اور اس کے لیے پڑھائی کا بوجھ بڑھا دیا جائے تو اس سے بچے کی فطری اور ہمہ جہتی ترقی میں کوئی مدد نہیں ملتی۔

آج والدین اپنے بچوں کو سود مند کورسوں میں داخلہ دلوانا چاہتے ہیں، انھیں ڈاکٹر اور انجینئر بنانا چاہتے ہیں اور مقابلہ جاتی امتحانات میں کامیاب ہونے کے لیے ان پر مسلسل پڑھتے رہنے کا بوجھ بڑھاتے جاتے ہیں۔ نفسیاتی دباؤ کے سبب بچوں کی ذہنیت متاثر ہوتی ہے اور ناکامی کا خوف ان کو خودکشی تک کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔

بچوں کو تعلیم کے یکساں مواقع حاصل نہ ہونے اور معیار کے مسئلے پر اپنی تشویش کا اظہار کرتے ہوئے ڈاکٹر جوشی نے یہ بھی کہا کہ جب تک مادری زبانیں نظرانداز کی جاتی رہیں گی، تعلیم کا دوہرا معیار برقرار رہے گا اور مادری زبانیں پڑھنے والے لوگ ''چپراسی'' اور انگریزی پڑھنے والے ''افسر'' بنتے رہیں گے۔ تعلیم کے معیار میں جب تک یہ فرق رہے گا، حالتِ موجودہ میں کوئی تبدیلی نہیں آئے گی۔

یہ بات توجہ طلب ہے کہ 2001 میں 6 سے 14 سال تک کی عمر کے بچوں کی تعلیم کو ان کا بنیادی آئینی حق تسلیم کر لیے جانے کے بعد اس کے نفاذ کے لیے عملی اقدامات کیے جا رہے ہیں۔ اسے قانونی شکل دینے کے لیے گذشتہ دنوں Free and Compulsory Education for Children Bill 2003 تیار کیا گیا تھا۔ مذکورہ 22 نکاتی قومی چارٹر بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اس چارٹر میں بچوں کی مفت اور لازمی تعلیم کے اہتمام کے ساتھ ساتھ ہر قسم کی بچہ مزدوری پر پابندی لگانے کا بھی عزم ظاہر کیا گیا ہے اور لڑکیوں کے حقوق کے تحفظ پر خصوصی توجہ دی گئی ہے۔

تعلیم کے دوہرے معیار کو ختم کرنے کے لیے جو تجاویز رکھی گئی ہیں، وہ بھی قابلِ توجہ ہیں۔ مفت اور لازمی تعلیم کے مسودے میں یہ شرط رکھی گئی ہے کہ CBSE یا صوبائی بورڈوں سے ملحق بھی غیرسرکاری یا پرائیویٹ اسکولوں کے لیے لازمی ہوگا کہ وہ خطِ افلاس سے نیچے زندگی گزارنے والے بچوں کے لیے 20 فیصد سیٹیں مختص کریں۔ دوہرے معیار کو ختم کرنے کے لیے مادری زبانیں ایک بڑا کارآمد وسیلہ ثابت ہو سکتی ہیں لیکن ابھی یہ بات واضح ہو کر سامنے نہیں آئی ہے کہ اس سلسلے میں عملی صورتِ حال کیا ہوگی اور ایسی حکمتِ عملی کن خطوط پر ترتیب دی جائے گی جس کے سبب مادری زبانیں تفریق کو ختم کرنے کا قرار واقعی اور مؤثر وسیلہ بن سکیں گی۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ اس حکمتِ عملی کے نفاذ کے وقت ہر علاقائی زبان کے بچوں کو اپنی زبان میں تعلیم حاصل کرنے کا موقع کس طرح فراہم ہوگا۔ اس سمت میں جو سنجیدہ کوششیں کی جائیں گی، ان سے دو طرح کے مثبت نتائج سامنے آئیں گے — یعنی تعلیم کا مقصد تو پورا ہوگا ہی، ساتھ ہی ساتھ ہندستانی زبانوں کے فروغ کی سمت میں بھی یہ ایک اہم قدم ہوگا۔

جہاں تک تعلیم کے فروغ کا تعلق ہے، اعداد و شمار کے مطابق حالات خاصے امید افزا ہیں۔ 2001 کی مردم شماری کے جو تجزیے حال ہی میں سامنے آئے ہیں، ان کے مطابق گذشتہ صدی کے آخری دہے میں ہندستان کی آبادی میں اٹھارہ کروڑ کا اضافہ ہوا ہے جبکہ اس مدت میں 20 کروڑ سے زیادہ لوگ خواندہ بنے ہیں۔ یہ تعداد بہت اہم تو نہیں ہے لیکن خوش آئند ضرور ہے کیوں کہ اٹھارہ کروڑ کے مقابلے میں 20 کروڑ لوگوں کی خواندگی کا مطلب ہے کہ ہماری کل آبادی میں 2 کروڑ خواندہ لوگوں کا اضافہ ہوا ہے۔ اگر اس رفتار سے بھی خواندگی بڑھتی رہی تو وہ دن دور نہیں جب تمام لوگ خواندہ ہو جائیں گے اور اس کا مثبت اثر بچوں کی مجموعی تعلیم اور اس کے معیار پر پڑے گا۔

تعلیم کا معیار یکساں کرنے میں مادری زبانوں کے رول کے حوالے سے یہ بات غور طلب ہے کہ تمام سرکاری اسکولوں کا ذریعۂ تعلیم علاقائی زبانیں ہی ہیں۔ بس ضرورت اس بات کی ہے کہ علاقائی زبانوں میں دی جانے والی یہ تعلیم اتنی ہی معیاری ہو جائے جتنی کہ انگریزی میڈیم کے اچھے اسکولوں میں ہوتی ہے۔ یہ کام نصاب میں مسلسل تبدیلی کے عمل کو جاری رکھے بغیر ممکن نہیں۔ اساتذہ کی تربیت کے ماڈل اور انفراسٹرکچر کے مسائل کو بھی اس ضمن میں سامنے رکھنا ہوگا۔ حکومت اگر علاقائی زبانوں کی تعلیم کو معیاری انگریزی میڈیم کے مساوی بنانے میں کامیاب ہو سکے تو ہندستانی جمہوریہ کا یہ سب سے بڑا کارنامہ ہوگا۔

سید محمد خاتمی

گیسٹ کالم

تمدنوں کے درمیان گفتگو اور نیا ہزارہ

میرے لیے بہت ہی خوشی اور مسرت کی بات ہے کہ میں آپ لوگوں سے یونیسکو (UNESCO) کے جلسے میں آج کے اہم تہذیبی اور سیاسی مسائل پر خطاب کر رہا ہوں۔ آئندہ نسلوں پر اس مسئلے کا بہت اثر پڑے گا، ان کو برے اثرات سے نجات ملے گی اور اخلاقی، روحانی اور جمالیاتی طور پر تقویت حاصل ہوگی۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ تمدنوں اور تہذیبوں کے درمیان مجوزہ گفتگو اور مذاکرے کے نتیجے کے سلسلے میں ضرورت سے زیادہ پراُمید ہونا یا بے حوصلگی اور مایوسی، دنیا کی موجودہ صورت حال کے پیشِ نظر ایک طرح کی مبالغہ آرائی ہوگی۔ لیکن اس تجویز کے سلسلے میں جو رکاوٹیں ہیں، ان کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے۔ ظاہر ہے ہمیں اس طول طویل، دشوار گزار اور خطرناک راستے کا اندازہ ہونا چاہیے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس تجویز پر عمل درآمد کے امکانات کا شعور ہونا بھی ضروری ہے چونکہ انسانی زندگی کے مستقبل پر اس کے مستقل سیاسی اثرات مرتب ہوں گے جن کے نتیجے میں تاریخ ساز واقعات رونما ہوں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس تجویز کا بین الاقوامی حلقوں میں خصوصاً اقوامِ متحدہ جنرل اسمبلی نے پرجوش اجلاس میں خیر مقدم کیا گیا۔ اس تجویز کی اہمیت کے لیے یہ کچھ کم نہیں کہ اس کا ساری دنیا کے عوام ہی نے نہیں، دانشوروں نے بھی بھرپور استقبال کیا۔

ایسا نہیں ہے کہ دنیا والے ہر صدا پر لبیک کہنے کو تیار رہا کرتے ہیں۔ اس کو بہت سی مثالوں سے واضح کیا جاسکتا ہے۔ ماضی میں بھی فیاض اور خیر اندیش حضرات، کچھ مفکرین یا کچھ انقلابی لوگ دنیا کے کسی بھی گوشے سے اپنے عہد و پیماں کی تجدید کے لیے یا پرانے انسانی خیالات کی جگہ پر نئے معاشرے کو وجود میں لانے کے لیے اپنی آوازیں بلند کیا کرتے تھے۔ البتہ یہ انتہائی مخصوص موقع ہے کہ عالمی برادری نے تمدنوں کے درمیان گفتگو کی آواز پر لبیک کہا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس واقعے کے اسباب کی تشریح اور توضیح میں سماجی اور سیاسی تسلیم شدہ عقیدہ یا موجودہ فلسفیانہ نظریہ قابلِ قبول نہیں ہے۔ اس تصور پر مبنی تمام تمدنوں کے درمیان گفتگو کی تجویز کو سب سے پہلے اسلامی جمہوریہ ایران نے اقوامِ متحدہ جنرل اسمبلی کے 53ویں اجلاس میں کیوں پیش کیا اور اس کو ایسی غیر معمولی پذیرائی کیوں حاصل ہوئی؟ اس سوال کا جواب دینے کے لیے قومی مفاد اور سیاسی مصلحتوں کے بجائے انسانی ابلاغ و ترسیل کے بعض رائج اسباب و عوامل کی وضاحت لازمی معلوم ہوتی ہے اور "تمدنوں کے درمیان گفتگو" کے بنیادی تصور اور گفتگو کے حقیقی معنی و مفہوم پر اچھی خاصی بحث کی جاسکتی ہے۔

گفتگو کی لازمی تعریف پر کیا جانے والا مذاکرہ و مباحثہ ہمیں تاریخ اور فلسفے کے دائرے میں داخل کردے گا اور پھر ہمیں 'گفتگو' (Dialogue) کے فلسفیانہ پہلو اور لفظیات کو ایک دوسرے سے علاحدہ کرنا پڑے گا۔ اس کے علاوہ اس سلسلے میں اہلِ علم کی رائے پر بھی غور کرنا ہوگا۔ جب ہم دنیا کو "ڈائیلاگ" یعنی گفتگو کی دعوت دیتے ہیں تو یہ لفظ اپنے وسیع معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ پس وہ جلسے جو مختلف سوالات پر بحث کے لیے منعقد ہوتے ہیں، وہ صحیح معنوں میں ڈائیلاگ کی مثال ہیں۔ تہذیب و تمدن اور فنونِ لطیفہ کے ساتھ ساتھ سائنسی اور ادبی سرگرمیاں ڈائیلاگ کا ہی ایک عملی رنگ روپ ہیں۔

"تمدنوں اور تہذیبوں کے درمیان گفتگو" کچھ ایسی چیزوں پر مشتمل ہے جن میں ظاہری طور پر اختلاف بلکہ تضاد پایا جاتا ہے۔ 'گفتگو' اتنی ہی قدیم ہے جتنی قدیم انسانی تہذیب و تمدن اور اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ ایک جدید اصطلاح بھی ہے۔ ایک مخصوص وقت میں رونما ہونے والے واقعے کا بیان درحقیقت ڈائیلاگ کی صحیح تعریف ہوگی۔ مذکورہ اختلاف کو دور کرنا کچھ مشکل کام نہیں۔ ہمیں تہذیب و تمدن اور انسان کی تعریف اس طرح کرنی ہوگی کہ یہ ڈائیلاگ کے جوہر سے نہ ٹکرائے۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ انسان کے وجود کے اجتماعی پہلو پر ہم زیادہ توجہ کریں گے، انسانی تمدن کے وسیع اور بے کراں وصف کو خاص اہمیت دیں اور خاص طور سے اس پر زور دینا ہوگا کہ کوئی بھی بڑی تہذیب یا عظیم تمدن تنہائی میں نہیں پنپ سکا ہے۔ دوسرے لفظوں میں تہذیبوں اور تمدنوں کے صرف وہی حصے باقی رہ سکے ہیں جو ترسیل اور ابلاغ کی توانائی رکھتے تھے، جن میں کہنا سننا دونوں شامل ہیں۔ سننا ایک ایسی نعمت ہے جس کو بڑھانا چاہیے اور یہ صفت ہر ایک میں آسانی سے پائی بھی نہیں جاتی ہے۔ اس کو حاصل کرنے کے لیے ایک سخت تربیت کا کورس کرنا پڑے گا جس کے لیے اپنی اخلاقی اور عقلی صلاحیت کو بڑھانا ہوگا۔ سننا ایک مجہول یا کمزور کام نہیں ہے۔ یہ ایک مؤثر مصروفیت ہے جس میں سننے والے کے سامنے ایک

● اقوام متحدہ کی تعلیمی، سائنسی اور ثقافتی تنظیم کے سالانہ اجلاس میں صدر اسلامی جمہوریہ ایران عالی جناب سید محمد خاتمی کا خطاب 'تمدنوں کے مابین گفتگو' کے موضوع پر بے حد اہمیت کا حامل ہے۔ اسے کسی قدر اختصار کے ساتھ قارئین "اردو دنیا" کی نذر کیا جارہا ہے۔ اس کا ترجمہ جناب اختر مہدی نے کیا ہے۔

ایسی دنیا وجود میں آتی ہے یا کشف ہوتی ہے جسے بولنے والا پیش کرتا ہے۔ توجہ اور مستعدی سے سنے بغیر ڈائیلاگ کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے۔

تمدنوں کے درمیان گفتگو کے معنی و مفہوم کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ مختلف نکتوں کو اچھی طرح سمجھا جائے۔ ان اہم نکتوں میں سے ایک یہ ہے کہ ایک طرف فنکار اور سیاستداں کے درمیان موجودہ تعلقات اور دوسری طرف سیاست اور اخلاقیات کے درمیان موجودہ روابط کو بخوبی سمجھا جائے۔ یہ دیکھنا ضروری ہے کہ ایک بڑے سیاست داں اور ایک ماہر فنکار کے درمیان تعلقات کی نوعیت کیا ہے؟ دونوں کے درمیان اختلاف ظاہر ہے کیونکہ وہ دونوں دو مختلف انسانی میدانوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ کون سے میدان ہیں جن میں وہ ایک ساتھ ہیں اور کس پہلو سے ان کے درمیان مقابلہ کیا جاسکتا ہے؟ سیاسی تعلقات میں بعض ڈپلومیٹک رشتوں کی موجودگی بجائے خود ایک ہنر ہے۔ اگر چہ فنون لطیفہ کی تعریف کئی طرح سے کی جاسکتی ہے اور ہم کو کسی ایک کو اختیار کرنے کی آزادی ہے لیکن ہم یہ حقیقت بھلا نہیں سکتے کہ فنکار ایک ایسا شخص ہے جو موجودہ زمانے میں رہنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور وہ اپنے موجودہ کو ایک ابدی زمانے میں بدل سکتا ہے۔ اس ابدیت کو موجودہ سے بدلنے میں فن کار فن کا ایسا نمونہ تخلیق کرسکتا ہے اور ہم سامع اور ناظر کی حیثیت سے اس کے مسحور تماشائی بن جاتے ہیں۔ یہی وہ کام ہے جو ایک فنکار کا جادوئی کمال ہوتا ہے اور صرف بڑے فنکار ہی یہ مقام حاصل کرنے کے قابل ہوتے ہیں۔ اس مرحلے میں ایک فن پارے کی تاریخی قسمت ''دوام'' سے رنگ دی جاتی ہے۔ ہم اس حقیقت کے شاہد ہیں کہ قوموں کی تاریخی قسمت کا ڈھانچہ بڑے سیاستداں کسی خاص موقعے پر تیار کرتے ہیں۔

مجھے امید ہے کہ یہ الفاظ آپ کو کوئی پرانا اختلاف یاد نہیں دلائیں گے جیسے تاریخ پر شخصیتوں کے اثر کے بارے میں طرح طرح کے مباحثے ہوتے رہے ہیں کیونکہ سر دست میں اس سلسلے میں کسی طرح کا بھی مباحثہ کرنے کی نیت نہیں رکھتا۔

ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ سیاسی ماہروں اور فنکاروں کے درمیان تخلیق کے سوا کوئی دوسری چیز مشترکہ صفت کا درجہ نہیں رکھتی ہے۔ جب تخلیق آجاتی ہے تو تکرار یا نقالی بالکل بے معنی ہو جاتی ہے، مزید برآں تخلیق کا پورا اظہار کسی بھی شخص میں اس کی قوت پر ہے۔

ایک بڑا فنکار فنی حقیقت کو تخلیقی قوت سے حاصل کرتا ہے اور ایک بڑا سیاستداں اسی کی طرح اپنے ملک کے بنیادی اور بڑے مسائل کو اسی قوت، اٹل ارادے اور خلاقیت سے حل کرتا ہے۔

آج سیاستداں ایک روشن مستقبل کو وجود میں لانے کے لیے لمبے قدم اٹھا سکتا ہے۔ ایسا مستقبل جو مبنی بر انصاف، زیادہ انسانی اور زیادہ خوبصورت ہو۔ ''تمدنوں کے درمیان گفتگو'' کی تجویز کو بروئے کار لاکر فقط اپنے ملکوں کے لیے ہی نہیں بلکہ پوری دنیا کے لیے ایک روشن مستقبل کی تعمیر و تشکیل کا کام انجام دیا جاسکتا ہے۔

ایک اور نکتہ جو میں یہاں بیان کرنا چاہوں گا، اس کا سیاست اور اخلاق کے درمیان تعلقات اور تہذیبوں کے درمیان گفتگو سے گہرا رشتہ ہے۔ اخلاق اور سیاست کے درمیان تعلقات کے سلسلے میں نظریاتی اعتبار سے کافی کہا جاچکا ہے لیکن جو چیز ہمارے لیے باعث تشویش ہے وہ یہ کہ تمدنوں کے درمیان گفتگو کی تجویز کے اخلاقی پہلو کی طرف کم توجہ کی گئی ہے۔ اس تجویز کو بروئے کار لانے کے لیے سیاسی اخلاق میں ایک بنیادی تبدیلی کی ضرورت ہے۔ عاجزی، مصمم ارادہ اور مقصد سے مکمل وابستگی، یہ تین اہم اخلاقی ضروریات ہیں جن کے ذریعے سیاست اور بین الاقوامی تعلقات کے میدانوں میں اس تجویز کو پسندیدگی و مقبولیت حاصل ہوسکتی ہے۔

تمدنوں کے درمیان ثقافتی گفتگو کے سلسلے میں ایک اور اہم نقطۂ نظر یہ ہے کہ ''ڈائیلاگ'' کی اصطلاح یہاں پر بہت ہی محدود اور تنگ معنوں میں استعمال ہوئی ہے۔ یہ اس تصور سے مختلف ہے جس کا مطلب ثقافتی تعلقات، باہمی ثقافتی تبادلات سے ہے۔ اس میں بہت سے اسباب و عوامل کارفرما ہوتے ہیں جیسے جنگ، جو ثقافتی اور سائنسی تعاون کی ایجاد کرتی ہے یا جس کے نتیجے میں ایک تہذیب کے دوسری تہذیب پر غلبے کا سبب جارحیت ہوتی ہے۔ لیکن ہمارے عہد میں یہ سب کچھ اطلاعات کی ٹیکنالوجی کی مدد سے ہوتا ہے۔

لیکن یہ گفتگو کسی خاص موقع و محل اور مخصوص نفسیاتی، فلسفیانہ اور اخلاقی حالات میں بھی ممکن ہے۔ خاص نقطۂ نظر اور عقیدے کا حامل سیاسی، اخلاقی مذہبی یا کسی خاص فلسفیانہ نظام میں یقین رکھنے والا کوئی آدمی دعوا نہیں کرسکتا کہ وہ ''گفتگو'' کی حمایت کرتا ہے۔ ایک سچے اور حقیقی ڈائیلاگ یا گفتگو کے لیے علوم متفرقہ کے بارے میں اطلاعات کی موجودگی لازمی ہے جس کے بغیر کوئی بھی ڈائیلاگ اپنے حقیقی معنی و مفہوم کے اعتبار سے ممکن ہی نہیں ہے۔ اس لیے دنیا کی تنظیموں جیسے یونیسکو کے لیے ضروری ہے کہ وہ علوم متفرقہ پر تحقیقی کام کرائے اور عالمی برادری کے لیے علوم کو مقبول و پسندیدہ بنا کر ان کی اشاعت کا اہتمام کرے۔

علوم اور تمدنوں کے درمیان گفتگو کی اصل تجویز جدیدیت اور مثبت پسندی کے عقیدے کا نام نہیں اور نہ ہی وہ شدید فراریت جو جدیدیت کے مابعد سے میل کھاتی ہے۔ لہٰذا تمدنوں اور تہذیبوں کے درمیان گفتگو جیسے نظریے اور تجویز کی وکالت کرنے والوں کا فرض ہے کہ وہ اس نظریے کی فلسفیانہ اور عالمانہ حقیقت کو کسی طرح کی آمیزش سے پاک رکھیں اور آئندہ بھی پاک صاف رکھنے کی کوشش کرتے رہیں۔ مابعد جدیدیت کے مفکرین میں پائی

جانے والی غیر معمولی شدت پسندی کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ دنیا کے ان ہزاروں لوگوں کی درد بھری آواز کی طرف متوجہ نہیں ہیں جو ظلم سے نجات اور حق و انصاف کی بحالی کے خواہاں ہیں۔

تمدنوں کے درمیان گفتگو کے سلسلے کی ایک اور ابتدائی شرط صبر و تحمل ہے۔ اگرچہ صبر و تحمل ایک ایسی ضرورت ہے جس کا گفتگو کے ابتدائی مرحلے میں ہی ہونا لازمی ہے لیکن ہمیں نہایت ہوشیاری کے ساتھ منفی تحمل اور مثبت تعاون کے درمیان فرق کرنا ہوگا کیونکہ اول الذکر ایک جدید تصور ہے اور آخر الذکر یعنی مثبت تعاون مشرقی مذاہب اور فلسفوں کا تجویز کردہ ہے کہ وہ اپنے موجودہ منفی صبر سے مثبت عوامی تعاون کی سطح تک پہنچ سکے۔ کوئی بھی مسلمان جو قرآن سے آشنا ہے اس کو وہ آسمانی صدا یاد آتی ہے جس میں عوام کو انسانی سرگرمیوں کے سلسلے میں خیر اور صداقت کی دعوت دی گئی ہے۔ جیسے ہی وہ تعاون کا لفظ سنتا ہے اس کو وہ قرآنی آیت یاد آجاتی ہے جس میں رحم اور نیکی میں تعاون پر زور دیا گیا اور یہ کہا گیا کہ سبھی انسانوں کا مثبت سرگرمیوں میں شرکت کرنا لازمی ہے۔ یہی وہ گرانقدر صفات ہیں جو تیسرے ہزارے میں دین کو نیا روپ دینے والی ہیں۔ ضروری ہے کہ کوئی بھی قوم اپنے فلسفیانہ سیاسی یا اقتصادی استدلال کی بنا پر اس سے الگ نہ رہے۔ صرف یہ کافی نہیں ہے کہ دوسروں کو برداشت کیا جائے بلکہ اہم بات یہ ہے کہ دوسروں کے ساتھ مل کر کام کیا جائے۔ تمام انسانوں کی شرکت سے انسانوں کی دنیا کا نقشہ بدلا جاسکتا ہے۔ اگرچہ بیسویں صدی کے آغاز تک یہ ایک انسانی کہاوت ہی لگتی تھی لیکن آج یہ انسانی زندگی کے دوام اور تسلسل کے لیے ایک ضرورت بن گئی ہے۔

یہ تعاون صرف اقتصادی اور سیاسی سطح پر نہیں ہوگا بلکہ لوگوں کے دلوں کو قریب تر کرنے کے لیے ہمیں نئے راستے تلاش کرنے چاہئیں کہ کیسے لوگوں کے درمیان موجود ذہنی خلیج کو پاٹا جائے۔ کوئی بھی شخص دلوں کو ملانے کے عمل میں اس وقت تک زیادہ پر امید نہیں ہوسکتا جب تک اس کے ذہن میں مذہبی، فلسفیانہ اور اخلاقی بنیادوں میں ٹکراؤ موجود ہے۔ دلوں کو نزدیک لانے کے لیے ذہنوں کو نزدیک لانا ضروری ہے اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک دنیا کے بڑے مفکرین دوسروں کے افکار اور تصورات کو سمجھنے کی خصوصی کوشش نہ کریں اور پھر انھیں اپنے لوگوں تک نہ پہنچائیں۔ یہ ضروری ہے کہ بنیادی تصورات کے بارے میں جو دل اور دماغ سے متعلق ہیں، بات کی جائے اور ہر آدمی اس سلسلے میں اظہار خیال کرے کہ وہ زندگی کا کیا مطلب سمجھتا ہے؟ خوشی اور مسرت کے معنی کیا ہیں؟ اور لطف سے کیا مراد ہے؟ اس کا کوئی فوری نتیجہ تو نہیں ہوگا لیکن اس کے بغیر کسی بھی اقتصادی اور سیاسی اتحاد و اتفاق کا نتیجہ عارضی اور سرد نکلے گا۔ بیسویں صدی اگرچہ تاریخ میں اپنے مظالم اور جنگوں اور بے شمار زیادتیوں کے لیے یاد رکھی جائے گی لیکن اسی کے ساتھ ساتھ بہت سے نئے فلسفیانہ تصورات اور سیاستدانوں کے عاقلانہ اقدامات کے لیے بھی یاد کی جائے گی۔ اس صدی میں رونما ہونے والے خونیں اور دہشت آلود واقعات سیاسی فکر میں تبدیلی لائے بغیر نیز بین الاقوامی تعلقات میں تبدیلی لائے بغیر، تمدنوں اور تہذیبوں کے درمیان گفتگو کی قدیم روایت کو بحال کیے بغیر رو کے نہیں جاسکتے۔

مذہبی عقیدے کو غیر متحرک چیز نہ سمجھنا چاہیے، نہ مذہب کے سلسلے میں ہماری فہم میں تبدیلی کو عقیدے کی روح سے ملانا چاہیے۔ کیونکہ اس طرح کا عدم توازن مذہبوں کے درمیان گفتگو میں ایک رکاوٹ بن جائے گا جبکہ توازن ایک دیرپا امن کے حصول کے لیے پہلی سیڑھی ہے۔ جیسے ہم اپنی روزمرہ کی روٹی اور پانی زمین سے حاصل کرتے ہیں اسی طرح سے روزمرہ کے تازہ اور زندہ عقیدے کا حصہ آسمان سے حاصل کرنا چاہیے۔ عقیدہ ایک بہتے ہوئے دریا کی طرح ہے اور اس میں جمود کی دلدل کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ عقیدہ جب مسلسل آگے بڑھ رہا ہو تو اس سے اخلاقیات اور امن کا ثمرہ حاصل ہوتا ہے اور انسان دنیا سے اور اپنے ساتھی انسانوں سے محبت کرتا ہے۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ جس صلح پر زور دیا جارہا ہے وہ ایک مخصوص قسم کی صلح ہے جس کو نام نہاد Pax Romana یعنی وسعت پسندانہ صلح کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ اس صلح کو حاصل کرنے کے لیے طاقت اور قانون جیسے ضامنوں کی ضرورت پڑتی ہے اور طاقت کے بغیر اسے برقرار رکھنا ناممکن ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی صلح کسی کے کام آنے والی نہیں ہے جبکہ گفتگو کے ذریعے حاصل کی گئی صلح انسان کی بلوغیت کی دلیل ہے۔ وہ خود بخود وجود میں آتی ہے اور اس کے ذریعے ہی انسان کو منطقی اور نفسیاتی ترقی حاصل ہوتی ہے۔ عاقلانہ ترقی میں پیچھے کی طرف لوٹنا تقریباً ناممکن ہے۔ اس طرح کی صلح یقیناً دیرپا اور دوررس ہوا کرتی ہے جس کی وجہ سے ''تہذیبوں کے درمیان صلح''، ''مذہبوں کے درمیان صلح''، ''تمدنوں کے درمیان صلح'' اور ''انسان اور فطرت کے درمیان صلح'' حاصل ہوتی ہے۔

آج انسان اور فطرت کے درمیان بقائے باہم کو اولین ترجیح دینی چاہیے۔ انسان اور فطرت کے درمیان پرانا تعلق جس میں انسان فطرت سے محبت کرتا تھا، اس کی برکتوں سے فائدہ اٹھاتا تھا اور اس کی قربت میں پناہ لیتا تھا، آج وہ فطرت کو آلودہ اور برباد کرنے میں مصروف ہے۔ ماقبل تاریخ سے جدید زمانے تک ہزاروں سال کی مدت گزر گئی لیکن اس طویل مدت کے دوران انسان نے فطرت کو صرف طاقت کا منبع نہیں سمجھا۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ انسان نے زمین اور اس کے ثمرات سے فائدہ نہیں اٹھایا، وہ اپنی سماجی اور شہری زندگی کو ترقی دینے کے عمل میں مصروف نہیں رہا یا اپنے اردگرد کے فطری ماحول میں معمولی تبدیلیاں نہیں کرتا رہا۔ اس نے اپنے آپ کو

فطرت کے مطابق اور فطرت کو اپنی ضرورت کے مطابق ڈھالنے کا عمل جاری رکھا ہے۔ یقیناً وہ سب کچھ کرتا رہا ہے لیکن اس نے کبھی بھی فطرت کو ''صرف ایک شے'' کے طور پر نہیں سمجھا۔

تمام تہذیبوں اور رواجوں میں، تمام نسلی گروہوں میں اور دنیا کی سبھی اقوام میں بہت سارے ایسے رسم و رواج موجود تھے جن کو مختلف اوقات میں اور مختلف جگہوں پر روبہ عمل لایا جاتا تھا جن کا تعلق فطرت کے واقعات سے تھا۔ لیکن جس چیز کو آج کے زمانے میں ''لاتعلقی'' کہا جاتا ہے اس نے نہ صرف یہ کہ پرانے رواجوں کو بدل دیا بلکہ فطرت سے انسانی تعلقات کو بھی بدل دیا۔ اس نے ایک ایسی صورت حال پیدا کردی ہے جس میں انسان دنیا اور اس میں جو کچھ ہے اس کو بامعنی، مفید اور مکمل نہیں سمجھتا، کیوں کہ انسان فطرت سے وابستہ نہیں رہا ہے۔ سمندر، پہاڑ، جنگل اور صحرا اب اس کے لیے صرف مادی ضروریات کی تکمیل کی خاطر مختلف صورتوں میں موجود ہیں۔ فطرت سے انسانوں کے قریبی اور گہرے تعلقات کمزور ہوگئے ہیں۔ تمدنوں اور تہذیبوں کے درمیان گفتگو کے لیے سب سے اہم اور فوری مسئلہ یہی ہے جس سے ساری انسانیت متاثر ہورہی ہے اور قدرتی طور پر اس کو اپنے ایجنڈے میں سرفہرست رکھنا چاہیے۔ فطرت سے انسان کا تعلق تمدنوں اور تہذیبوں میں گفتگو کی فہم کو قدرتی طور پر آج کے دور میں ایک دلچسپ مباحثہ میں شامل کردے گا جس کا موضوع بین الاقوامی صورت حال ہوگی۔ آج کا انسان انصاف، امن، آزادی اور سلامتی کی تلاش میں سرگرداں ہے اور وہ ان قدروں کا ہمیشہ متلاشی رہا ہے۔ تمدنوں کے درمیان گفتگو کے ذریعے جس امن کا حصول لازمی ہے وہ اگر ایک دفعہ حاصل ہوگیا تو یقیناً دیرپا بھی ہوگا۔

ہم جس گفتگو کو امن و سلامتی کی بنیادی اور لازمی ضرورت قرار دیتے ہیں اس سے ہماری مراد وہ گفتگو ہے جو سفارتی معاہدوں اور سمجھوتوں سے جدا ہو۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ تاریخ میں ایسے بہت سے مواقع آئے ہیں جب جنگ اور صلح ایک دوسرے کے ساتھ موجود رہے ہیں۔ گفتگو سے ہماری مراد ڈپلومیٹک زبان میں اپنے سیاسی اور اقتصادی مفاد کو بڑھانا، دشمن پر کامیابی حاصل کرنا اور مختصراً یہ کہ جنگ کو ایک دوسری شکل میں جاری رکھنا نہیں ہے۔ تمدنوں کے درمیان گفتگو ہمدردی، مہربانی اور باہمی مفاہمت کے بغیر ممکن نہیں ہے اور اس میں دوسروں کی نابودی کا خیال آنا بھی غلط ہے۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ تمدنوں اور تہذیبوں کے درمیان گفتگو دنیا میں بدنظمی اور اتھل پتھل پیدا کردے گی اور اس امکان سے انکار نہیں کیا جاسکتا لیکن ابتدائی مرحلے میں ہی اس عجلت پسندی کو روکا جاسکتا ہے جس سے اس حادثے کے ہونے کا امکان ہے اور یہ مقصد مناسب تعلیم اور تربیت کے ذریعے حاصل ہوسکتا ہے۔ دوسرے یہ کہ ہمیں عدم کارکردگی کو بھی ذہن میں رکھنا چاہیے خواہ ہم اس کو پسند کریں یا ناپسند، کیونکہ یہ انسانی وجود کے حوالے سے ایک ناگزیر مسئلہ ہے۔ موت اور ثقافتی انتشار و نابودی کے مقابلے میں زندگی اور ثقافتی ثبات بہرحال بہتر انتخاب ہے۔

جنگ اور جھگڑوں کی حقیقت کا گہرائی سے مطالعہ کیے بغیر تمدنوں کے درمیان گفتگو کا نظریہ آگے نہیں بڑھ سکتا ہے۔ اس طرح کے اختلافات اور جھگڑوں کا مطالعہ دنیا کی موجودہ صورت حال کو نگاہ میں رکھے بغیر بالکل الگ سے نہیں کیا جاسکتا۔ جنگیں اکثر نفسیاتی محرکات کے سبب ہوتی ہیں اور سماجی نفسیات کے ماہرین اور تجزیہ کار ایک عرصے سے اس کے مطالعے میں مصروف ہیں۔ غریب اور امیر ملکوں اور افراد کے بیچ خوفناک خندق کی موجودگی میں ہم امن اور باہمی افہام و تفہیم کی بات کیسے کرسکتے ہیں۔ عالمی سطح پر افراد اور ممالک کے درمیان پائی جانے والی عدم مساوات اور نابرابری کا بول بالا ہے اور دنیا کے کمزور اور پس ماندہ لوگوں کی ترقی کے لیے کوئی معاون قدم نہیں اٹھایا جارہا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے حالات میں ہم ان سے ''گفتگو'' کا مطالبہ کیسے کرسکتے ہیں، جبکہ تیسرے ہزارے کے آغاز کے موقع پر دنیا کی 30 فیصد آبادی بہت ہی غربت میں زندگی گزار رہی ہو۔ ہم انصاف کو بھلا کر امن اور سلامتی کی بات کیسے کرسکتے ہیں؟ اگر مغرب اپنی زندگی اور معاشرت کو بچانا چاہے اور دنیا کے دوسرے حصے کے لوگوں کی قسمت کو بھول جانا چاہے، تو بھی یہ کام ممکن نہیں ہے کیونکہ اپنی سلامتی کی خاطر دوسروں کی مدد کرنا ضروری ہے اور بہت سی سماجی، سیاسی اور تکنیکی وجوہات کی بنا پر آج کی دنیا کے سبھی لوگ ایک ہی جہاز پر سوار ہیں۔ طوفانوں کا منہ موڑنے اور ساحل پر سلامتی کے ساتھ پہنچنے میں یا تو سب کامیاب ہوں گے یا کوئی بھی نہیں۔ آج یہ بیان کچھ مبالغہ آمیز لگے گا لیکن کل اسے سمجھنا آسان ہوگا۔ تیسرے ہزارے کے آغاز میں ہماری دنیا مشترکہ قسمت کی حامل ہے۔ یہ قسمت انصاف، خوشی اور مسرّت پر مبنی ہے اور اس کے لیے واحد راستہ مختلف تمدنوں اور تہذیبوں کے درمیان گفتگو ہے۔ ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ بیسویں صدی میں تلوار نیام سے باہر رہی تو کچھ کو کامیابی حاصل ہوئی اور کچھ کو ناکامی۔ لیکن اگلی صدی کو گفتگو کے اردگرد گھومنا چاہیے۔ ورنہ یہ تلوار دودھاری بن کر سب کو ختم کردے گی اور یہ بھی ممکن ہے کہ طاقتور لڑاکو ہی اس کا سب سے پہلا شکار ہوں۔

□□□

میں نے ایوارڈ کے متعلق کبھی نہیں سوچا — دیو آنند

سوال: دادا صاحب پھالکے ایوارڈ ملنے کے بعد آپ کیسا محسوس کررہے ہیں؟

جواب: بہت اچھا لگ رہا ہے، میں ابھی مہابالیشور میں ہوں اور ایک نئی فلم کا اسکرپٹ لکھ رہا ہوں، یہ سرد اور کچھ حد تک کوہستانی علاقہ ہے۔ یہاں اگر میں اپنی آنکھیں بند کرلوں تو مجھے فطرت سے نزدیک ہونے کا احساس ہوسکتا ہے۔ قدرتی مناظر سے قریب رہنا میرے لیے زندگی کا سب سے بڑا اعزاز ہے۔ یہ مجھے کافی پسند ہے لیکن اگر آپ پوچھتے ہیں کہ دادا صاحب پھالکے ایوارڈ میرے لیے کیا معنی رکھتا ہے تو میں کہوں گا کہ میں نے ایوارڈ کے متعلق کبھی نہیں سوچا، میں اپنے آپ میں پوری طرح مشغول رہتا ہوں۔ جس سے مجھے بے حد طمانیت کا احساس ہوتا ہے۔ جیسے ہی ایک فلم مکمل کرلیتا ہوں اور وہ فلم بینوں کے درمیان جاتی ہے، جلد ہی دوسری فلم پر کام شروع کردیتا ہوں۔ کون جانے وہ فلم اچھی ہے یا بری اور کسے پرواہ ہے کہ وہ کامیاب ہوگی یا نہیں۔

سوال: مستقبل میں کیا کیا منصوبے ہیں؟

جواب: میں امریکی موسیقی پر مبنی ایک فلم "Song of life" بنا رہا ہوں لیکن بدقسمتی سے یہ تنازعہ کا شکار ہوگئی ہے۔ یہ فلم روی شنکر اور ان کی بیٹی نورا جانس کے بارے میں نہیں ہے اور نہ ہی اس کا اس خاندان سے کچھ لینا دینا ہے۔ یکسانیت صرف یہ ہے کہ یہ فلم ایک موسیقار اور اس کی بیٹی سے متعلق ہے۔ بہرحال "Song of Life" میری اپنی تخلیق ہے..... ہم اپنی موسیقی کے اعتبار سے کافی شہرت رکھتے ہیں۔ میں امریکی موسیقاروں اور اداکاروں کو لے کر اس طرح کی ایک میوزیکل کمپنی بنانا چاہتا ہوں تو اس میں غلط کیا ہے؟

سوال: ہندی فلم کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب: ہندی فلم بینوں کے لیے میں ایک فلم "Beauty Queen" (ملکۂ حسن) بنا رہا ہوں۔ حقیقتاً، ابھی مہابالیشور میں اسی فلم کا اسکرپٹ لکھ رہا ہوں۔ فطری طور پر اس فلم میں ایک نیا چہرہ ہوگا۔ جب میں Beauty Queen کا خیال کرتا ہوں تو ایک نئے چہرے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ اپنی پہچان بنا چکے اداکار کو تو سب جانتے ہیں۔ ہمارے اردگرد اتنی ساری ذہین اور قابل لڑکیاں ہیں جنھیں مواقع نہیں مل پا رہے ہیں۔

سوال: بالی ووڈ میں آنے والی زبردست اخلاقی تبدیلیوں کے بارے میں آپ کیا سوچتے ہیں؟

جواب: جہاں تک میں سمجھتا ہوں ہماری فلموں میں اخلاقی تبدیلی نہیں آئی ہے بلکہ صرف مقابلے کا انداز بدل گیا ہے۔ آج ہماری فلموں کا مقابلہ سیٹلائٹ ٹیلی ویژن اور عالمی سینما سے ہے۔ ناظرین اپنی حدود سے آگے نکل چکے ہیں اور اپنے فلمی Entertainment کے بارے میں کافی مخصوص نظریہ رکھتے ہیں اور انھیں ایسا کرنا بھی چاہیے۔ انھیں اپنا مخصوص نظریہ رکھنے کا پورا حق ہے۔ یہ آج کل کے فلم سازوں کے لیے ایک بہت بڑا چیلنج ہے۔ لہٰذا ہمیں ناظرین کے ذہن کو سمجھنا ہوگا۔ نہیں تو تفریح کا معیار کبھی بھی بہتر نہیں ہوسکے گا۔

سوال: جب آپ کے دوست اور ساتھ کام کرنے والے آپ کے جیسا جوش و ولولہ اور کمٹمنٹ نہیں دکھاتے تو کیا آپ کو مایوسی نہیں ہوتی؟

جواب: مجھے مایوسی نہیں ہوتی۔ میں ان کی پیسہ کمانے کی بے صبری کو سمجھ سکتا ہوں۔ جب کہ وہ کامیابی کی منزلوں پر ہیں وہ مواقع سے فائدہ اٹھا رہے ہیں اور اس کے لیے آپ انھیں مورد الزام نہیں ٹھہرا سکتے۔ البتہ میں صرف ان لوگوں کے ساتھ کام کرنے کی کوشش کرتا ہوں جن کے ساتھ مجھے کام کرنے میں آسانی ہوتی ہے۔ جو مجھے اپنا وقت دینے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے ہیں۔ جو لوگ کام کرنے کے لیے اور اپنی اہلیت ثابت کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں اور میرے اصول اور کمٹمنٹ کے مطابق کام کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میری فلموں میں آپ ہمیشہ نئے چہرے دیکھتے ہیں۔

● ہندی فلموں کے سدابہار ہیرو دیوآنند کو سال 2002 کا دادا صاحب پھالکے ایوارڈ دینے کا اعلان کیا گیا ہے۔ فلمی صنعت کا یہ سب سے بڑا اعزاز ہندستانی فلمی صنعت میں ان کی قابلِ قدر خدمات کے لیے دیا گیا ہے۔ دادا صاحب پھالکے ایوارڈ کے طور پر دو لاکھ روپیے نقد، ایک شال اور ایک طلائی تمغہ دیا جاتا ہے۔ دیوآنند نے بطور ہیرو اور بطور فلمساز ہندی سینما کو کئی یادگار فلمیں دی ہیں۔ "بازی"، "ٹیکسی ڈرائیور"، "سی آئی ڈی"، "کالا پانی"، "جیول تھیف"، "پینگ گیسٹ"، "ہم دونوں"، "تیرے گھر کے سامنے"، "گائیڈ"، "جانی میرا نام"، "ہرے راما ہرے کرشنا" اور "دیس پردیس" ان کی کامیاب فلمیں ہیں۔ 26ستمبر 1923 کو گورداس پور، پنجاب میں پیدا ہوئے دیوآنند دلیپ کمار اور راج کپور کے معاصر ہیں— ٹائمس آف انڈیا، نئی دہلی میں 13/دسمبر کو دیوآنند سے سبھاش کے۔ جھا کی گفتگو قارئینِ "اردو دنیا" کی نذر ہے۔ اس کا ترجمہ شکیل احمد نے کیا ہے۔

نثار احمد فاروقی

ہندستان اور قدیم عرب مؤرخین

عرب و ہند کے تجارتی تعلقات ظہور اسلام سے صدیوں پہلے قائم ہوچکے تھے۔ اس موضوع پر علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم نے اپنی دو عالمانہ و محققانہ کتابوں میں تفصیل سے بحث کی ہے۔ اُن کی کتاب ''عرب و ہند کے تعلقات'' سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں ملکوں میں تجارتی رشتہ بہت گہرا تھا۔ دوسری کتاب ''عربوں کی جہاز رانی'' یہ بتاتی ہے کہ عرب ملاح سمندری راستوں سے خوب واقف تھے اور سمندر میں دور دور تک کشتیاں کھیتے ہوئے جاتے تھے۔ واسکوڈی گاما کو ایک عرب ملاح ابن ماجد ہی کیرالہ میں کالی کٹ کے ساحل تک لے کر آیا تھا۔ عربی زبان میں ہندستانی زبانوں سے لیے ہوئے سیکڑوں الفاظ ملتے ہیں مثلاً: نارجیل (ناریل)، فلفل (پیپلی)، قرنفل (کرن پھول)، صندل (چندن)، کافور (کپور) وغیرہ۔ ہندستان کے ساحلی علاقوں خصوصاً گجرات، کوکن وغیرہ سے مسالے اور خوشبوئیں عرب کو جاتی تھیں۔ اس دور میں ہندستان نے فولاد تیار کرنے میں بڑی مہارت حاصل کرلی تھی۔ یہاں کی بنی ہوئی تلواریں بہترین سمجھی جاتی تھیں۔ اعلا درجے کی تلوار کو عربی میں مہند کہتے ہیں جس کا مطلب ہے ''ہندستان میں بنی ہوئی۔'' عربی کے کلاسیکی شاعر کعب بن زُہیر نے رسول اللہ ﷺ کی مدح میں جو قصیدہ کہا تھا اُس میں ایک شعر یہ تھا:

انّ الرسولَ لنور یُستضاءُ بہٖ
مُہنّد من سُیوفِ الہند مَسلُول

[رسول اللہ ﷺ ایسا نور ہیں جس سے روشنی حاصل کی جاتی ہے اور وہ ایک اُبی ہوئی ہندستانی تلوار ہیں۔]

اس کے دوسرے مصرعے میں رسول اللہ ﷺ نے خود اصلاح فرمائی تھی کہ یوں کہو:

مُہنّد من سُیوفِ اللہِ مَسلُول [وہ اللہ کی اُبی ہوئی تلواروں میں ہندستانی تلوار کی طرح آبدار ہیں۔]

یہ نکتہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ ہند، ہندی، ہندو، ہندستان سب لفظوں کی اصل بھی عربی ہی ہے۔ ابتدائی زمانے میں عرب صرف سندھ سے واقف تھے اس لیے کہ وہ بحر ہند کے ساحل پر تھا اور وہ سرندیپ (سری لنکا) جاتے ہوئے ادھر سے گزرتے تھے۔ سندھ سے آگے شمالی مشرقی علاقوں میں وہ بہت بعد میں پہنچے ہیں، اس لیے پورے ملک کو ''سندھ'' ہی سمجھتے اور کہتے تھے۔ لسانیات کا قاعدہ ہے کہ سین کی آواز ہائے ہوز (ھ) سے بدل جاتی ہے جیسے سونا (ہن) سپت (ہفت) وغیرہ۔ اسی قاعدے سے سندھ کا تلفظ ''ہند'' ہوگیا، پھر اُس پر فارسی کے ستان [سنسکرت: استھان] کا اضافہ کیا تو ہندستان ہوا، ہند پر یائے نسبتی لگائی تو ہندی کیا، اور واؤ بھی علامتِ نسبتی ہے اس لیے ہند سے ہندو بھی بن گیا۔

ظہور اسلام کے بعد بھی برّصغیر میں عربوں کی آمد کا سلسلہ اور تجارتی و ثقافتی رابطہ جاری رہا۔ رسول اللہ ﷺ نے بھی ہندستان کی طرف اشارہ کرکے فرمایا کہ ''ادھر سے ٹھنڈی ہوائیں آتی ہیں۔'' انبیا کے قصوں میں، اساطیر الاولین میں اور غیر تاریخی روایات میں ہندستان کا ذکر کثرت سے ملتا ہے۔ ایسی بہت سی روایات علامہ غلام علی آزاد بلگرامی نے اپنی کتاب **سُبحة المَرجان [طبع ممبئی 1303ھ]** میں جمع کردی ہیں جن میں یہ بھی ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام جنت سے نکل کر جب زمین پر اترے تھے تو اُن کا پہلا قدم ہندستان کی سرزمین پر ہی پڑا تھا اور یہ کہ اُن پر پہلی وحی بھی حضرت جبرئیل علیہ السلام ہندستان ہی میں لائے تھے۔ **سبحة المرجان** عربی زبان میں ہے اس لیے اس سے کم لوگ واقف ہیں، اس کے مطابق حضرت آدم سو سال تک ہندستان میں رہے، یہیں اُن کی توبہ اللہ نے قبول کی۔ اگر اس کتاب کا ہندی میں ترجمہ ہوجائے تو معلوم ہوگا کہ عربوں کو اس برّصغیر سے کتنا گہرا اور کتنا قدیم تعلق تھا۔ آزاد بلگرامی کہتے ہیں کہ حضرت آدم نے ہندستان کو اپنے وطن کے طور پر قبول کرلیا تھا۔ ظہور اسلام کے بعد بھی مسلمان یہاں برابر آتے رہے۔ خاص طور پر گجرات کے ساحلی علاقوں اور کیرالہ میں اُنھوں نے آباد ہونا بھی شروع کردیا تھا۔ ان نووارد لوگوں کا یہاں کے باشندوں نے کھلے دل سے استقبال کیا تھا، گجرات اور کیرالہ میں اُنھیں مسجدیں بنانے، اپنی عبادت کرنے اور اپنے مقدمات شریعتِ اسلامیہ کے مطابق طے کرنے کی آزادی بھی حاصل تھی۔ یہ مسلمان تجارت کرتے ہوئے آئے تھے اس لیے اُن کے تعلقات یہاں کے رہنے والوں سے سدا خوشگوار رہے۔

برّصغیر کے شمال مغربی حصے میں درۂ خیبر کی راہ سے آنے والے فاتحانہ حیثیت سے داخل ہوئے تھے اس لیے اُن کے تعلقات کی نوعیت مختلف رہی۔ دوسرے خلیفہ امیر المومنین حضرت عمر بن الخطابؓ کے زمانے میں ایک وفد خشکی کے راستے سے سندھ کی طرف بھیجا گیا تھا تاکہ وہ یہاں کے جغرافیائی حالات کا جائزہ لے کر رپورٹ پیش کرے۔ اس وفد نے شاید سندھ اور راجستھان کا کچھ صحرائی حصہ ہی دیکھا اور واپس جاکر یہ رپورٹ دی کہ **لوکثُرَ الجیشُ فیہا**

جاعُوا وان قلّت ضاعوا وہ ایسا علاقہ ہے اگر زیادہ فوج بھیجی جائے گی تو [بنجر علاقہ ہونے کی وجہ سے] بھوکی رہے گی۔ اگر فوج کم ہوئی تو [دشمن کی تعداد زیادہ ہونے کی وجہ سے] ضائع ہوجائے گی۔ بہر حال سندھ کا کچھ علاقہ حضرت امیر المومنین عثمان بن عفانؓ کے عہد خلافت میں فتح کرلیا گیا تھا۔

جب عباسی خلافت کا زمانہ آیا تو سب سے زیادہ بااثر اور ذہین، ہر دل عزیز اور وسیع النظر خاندان برامکہ کا تھا، یہ عباسی خلفا کے وزیر تھے۔ برامکہ عربی قاعدے سے "برمک" کی جمع ہے اور برمک دراصل سنسکرت زبان کا "پرکھ" [سردار، چیف] ہے۔ اسی طرح ہم "پیرِ مغاں" کہتے ہیں، مغاں فارسی قاعدے سے مُغ کی جمع ہے۔ مُغ دراصل سنسکرت کا مکھیہ (مکھیا) ہے۔ میخانے کے انچارج کو پیرِ مغاں کہا جاتا تھا۔ میکدے میں سروس کرنے والے مغبچہ کہلاتے تھے۔ برمکی خاندان کے لوگ ہندستان سے خراسان اور وہاں سے عراق تک پہنچے تھے۔ یہ اپنے قبیلے کے سردار تھے اس لیے "پرکھ" کہلاتے تھے۔ ان کی تفصیلی تاریخ عبدالرزاق کان پوری کی "تاریخ برامکہ" میں دیکھی جاسکتی ہے۔ یحییٰ بن خالد برمکی نے اپنی وزارت کے زمانے میں جب عام لوگوں کے لیے ایک بڑا اسپتال قائم کرنے کا ارادہ کیا تو اُسے معلوم تھا کہ برِصغیر میں بھانت بھانت کی جڑی بوٹیاں پائی جاتی ہیں اور وہ بہت سے امراض کے علاج میں کارگر ثابت ہوتی ہیں۔ یہاں کی دیسی طب (آیوروید) نے بھی بہت ترقی کرلی تھی، اس کا برامکہ کو علم تھا۔ اِس لیے یحییٰ بن خالد نے ایک وفد ہندستان کو بھیجا کہ وہ جڑی بوٹیاں جمع کرکے لائے اور چند اچھے ویدوں کو بغداد آنے کی دعوت دے۔ چنانچہ بغداد میں بہت سی جڑی بوٹیاں ہندستان سے آئیں اور بعض کی کاشت بھی شروع کی گئی، مگر جن پودوں کو وہاں کی آب و ہوا راس نہیں آئی وہ نہیں پھلیں۔ بغداد میں جو بڑا اسپتال بنایا گیا، اُس میں علاج **طبِّ الاعشاش** یعنی جڑی بوٹیوں ہی سے ہوتا تھا اور اس میں سب سے اہم رول آیورویدکا تھا۔ یہاں ہندستانی وید ملازم تھے جنھیں قدیم عربی کتابوں میں 'بیدبا" لکھا گیا ہے، یہ دراصل وید اور ویدیہ ہی کے تلفظ کی خرابی ہے۔ اس سے پہلے بنواُمیہ کے زمانے میں ہی ہندستانیوں سے کشتے (بھسم) بنانے کا طریقہ سیکھا جاچکا تھا، اس لیے کہ خالد بن معاویہ کو کیمیا بنانے کا شوق تھا اور مختلف دواؤں کے بھسم اُس میں کام آتے تھے۔

ہندستان کے فکر و فلسفے کی بھی اُس وقت کی دنیا میں شہرت تھی۔ یہاں سے کچھ کتابیں ایران کے راستے سے گئیں تو پنڈتوں کی مدد سے پہلے اُن کا فارسی میں ترجمہ کیا گیا پھر وہ عربی میں ترجمہ کی گئیں۔ سب جانتے ہیں کہ عربی نثر کی مشہور کتاب **کلیله ودمنه** دراصل سنسکرت کی "پنج تنتر" ہے۔ اب سنسکرت کی اصل کتاب ناپید ہے اور عبداللہ بن المقفع کا کیا ہوا عربی ترجمہ موجود ہے۔ ایک مشہور روایت ہے کہ سکندر کی فوج سے مقابلے میں راجا پورس کے ہاتھی اُلٹے اپنی ہی فوج پر پلٹ پڑے تھے اس لیے راجا پورس کو شکست ہوگئی تھی۔ اس بارے میں **کلیله ودمنه** سے یہ دلچسپ بات معلوم ہوتی ہے کہ ہندستان پر حملہ کرنے سے پہلے سکندر نے ہندستان سے فولاد کی ڈھلائی کا کام کرنے والوں کو بلوا کر لوہے کے قد آور گھوڑے بنوائے تھے۔ میدانِ جنگ میں ان گھوڑوں کو سب سے آگے رکھا گیا اور اُن کے پیٹ میں آگ بھر کر اُسے دہکا دیا گیا تھا۔ جب پورس کے ہاتھیوں نے اپنی سونڈ سے ان گھوڑوں کو پکڑنا چاہا تو اُن کی سونڈ جل گئی اور وہ چنگھاڑتے ہوئے اپنی ہی فوج پر پلٹ پڑے تھے۔ عرب عالموں نے جب تاریخ اور جغرافیہ کے موضوعات پر کام کرنا شروع کیا تو علمی سطح پر دونوں ملکوں کے تعلقات میں اور گہرائی پیدا ہوئی۔ نویں صدی ہجری کے دوسرے نصف میں سلیمان تاجر ہندستان آیا۔ دسویں صدی عیسوی میں المسعودی نے برِصغیر میں قدم رکھا۔ وہ سندھ، گجرات اور مہاراشٹر میں خوب گھوما پھرا۔ اُس نے یہاں کے حالات کسی قدر تفصیل سے لکھے ہیں۔ پھر ابوریحان البیرونی آیا وہ پنجاب، سندھ، کشمیر اور مدھیہ پردیش تک گیا ہے۔ یہاں رہ کر اُس نے سنسکرت زبان سیکھی اور اس میں ایسی مہارت پیدا کرلی تھی کہ مقامی پنڈت بھی ششدر رہ جاتے تھے۔ اُس نے اِس ملک کے تمام علوم، فلسفے، مذاہب اور رسوم و رواج کا گہرا ہمدردانہ مطالعہ کیا تھا۔ یہاں کی ثقافت، رہن سہن، فنِ تعمیر اور مصنوعات وغیرہ کو بہت غور سے دیکھا اور اُن سب کا تفصیلی بیان اپنی **کتاب الهند** میں کیا ہے۔ اس کتاب کے تراجم اردو، فارسی، انگریزی، جرمن اور فرنچ زبانوں میں ہوچکے ہیں۔ انگریزی ترجمہ مشہور مستشرق ایڈورڈ سی زخاؤ (Edward C.Sachau) نے کیا ہے اور اُس پر نہایت عالمانہ مقدمہ بھی لکھا ہے۔ زخاؤ البیرونی کو ہندستان کے محسنوں میں شمار کرتا ہے۔ البیرونی نے جو کچھ بیان کیا ہے، وہ اِس ملک کے بارے میں ہمارے پاس قدیم ترین مستند تاریخی بیان ہے۔ البیرونی کی خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ پہلا عرب اسکالر ہے جس نے مقدس گیتا کا بھرپور تعارف عرب دنیا سے کرایا اور گیتا کے تقریباً ایک چوتھائی حصے کا عربی ترجمہ پہلی بار اپنی کتاب میں پیش کیا۔

عرب سیاحوں اور مورخوں کی ایک لمبی فہرست ہے جنھوں نے ہندستان سے متعلق ریسرچ کی ہے اور اِس ملک کے بارے میں لکھا ہے۔ ان میں کچھ مورخ وہ ہیں جو خود یہاں آئے، یہاں کے حالات کا مشاہدہ کیا۔ کچھ وہ ہیں جنھوں نے دوسرے راویوں کے بیان پر بھروسہ کیا ہے۔ ان میں کتاب **الفهرست** [ابن الندیم] **کتاب السند و الهند** [سلیمان تاجر]، **الهند و مایُجاوِرُها من البلاد** [الادریسی] **کتابُ المسالک و الممالک** [ابن خردادبہ] ہے۔ **کتابُ الاعشیٰ** [القلقشندی]، **مسالک الابصار** [فضل اللہ العمری]، **تُحفة النُظّار** [ابن بطوطہ مراکشی وفات 779ھ]،

التقسیم فی معرفۃ الاقالیم [المقدسی]، **کتاب المسالک و الممالک** [الاصطخری]، **کتابُ الملل والنحل** [الشہر ستانی] **صورۃُ الارض** [ابن حوقل] **عجائب الہند** [بزرگ بن شہریار] **سلوۃُ الغریب** [ابن معصوم] وغیرہ ایک طویل فہرست اُن سیاحوں اور مؤرخوں کی ہے جنھوں نے برِّصغیر کے بارے میں اپنے مشاہدات یا اپنی معلومات وتحقیقات قلمبند کی ہیں۔ ان میں سے ہر کتاب میں ہندستان کا بیان نئے ڈھنگ سے ملتا ہے اور کسی نہ کسی نئے گوشے پر روشنی پڑتی ہے۔ بزرگ بن شہریار پہلا مصنف ہے جو ہمیں یہ اطلاع دیتا ہے کہ کسی ہندستانی زبان میں قرآن شریف کا سب سے پہلا ترجمہ ایک ہندو راجا کی فرمائش پر ہوا تھا۔ وہ کس زبان میں تھا؟ اس کا ذکر نہیں کرتا۔ مگر قیاس کہتا ہے کہ سندھی یا گجراتی یا کشمیری زبان میں ہوا ہوگا۔ سنسکرت میں ہوا ہو تب بھی کچھ تعجب نہیں۔ یہ مکمل قرآن کا ترجمہ نہیں تھا۔ اس کے لیے راجا نے اپنا سفیر بھیج کر خلافتِ بغداد سے ایک عالم کو طلب کیا تھا۔

صدر اسلام کے جن قدیم عرب علما نے اپنی تصانیف میں برِّصغیر کا ذکر کیا ہے اُن میں ابوزید بلخی، ابواسحٰق الاصطخری، محمد بن حوقل بغدادی اور ابوریحان البیرونی کے علاوہ ایک نمایاں نام المقدسی کا بھی ہے۔ المقدسی یا المقدسی بیت المقدس کی طرف وطنی نسبت ہے اور اس لقب سے وہ درجنوں علما مشہور ہیں جو یروشلم میں پیدا ہوئے جہاں بیت المقدس واقع ہے۔ مشہور مؤرخ اور جغرافیہ داں شمس الدین ابوعبداللہ محمد بن احمد بن ابی بکر البشاری صرف المقدسی کے مختصر لقب سے پہچانا جاتا ہے۔ اندازہ یہ ہے کہ وہ 336ھ/947ء میں پیدا ہوا اور 375ھ/985ء میں اُس کی وفات ہوئی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے زیادہ طویل عمر نہیں پائی۔ مگر عالمِ اسلام میں وہ مشرق سے مغرب تک سبھی ملکوں میں گیا اور اپنی جوانی کا بیشتر زمانہ سیروسیاحت میں بسر کیا۔ ادھر ہندستان میں وہ قنوج تک آیا، تو اُدھر اندلس [اسپین] اور مراکو تک گیا۔ اسی سیاحت کا نتیجہ اُس کی تصنیف **التقسیم فی معرفۃ الاقالیم** ہے جو آج سے ایک ہزار اٹھارہ سال پہلے 375ھ/985ء میں لکھی گئی تھی۔ اسے مشہور مستشرق ڈی غوئے [De Goeje] نے ایڈٹ کرکے 1877ء میں لندن سے شائع کیا تھا۔ اس کا دوسرا ایڈیشن 1906ء میں بھی چھپا تھا۔ المقدسی جن ملکوں میں گیا ہے، وہاں بسنے والوں کے طور طریقے، رسم و رواج، اوصاف و اخلاق اور اُن ملکوں کے طبعی حالات اختصار مگر جامعیت کے ساتھ بیان کرتا ہے۔ یہ معلومات اُس نے زیادہ تر ذاتی طور پر حاصل کیں یا اُس کے مطالعے اور مشاہدے پر مبنی ہیں۔ اُس نے اپنے متقدمین تاریخ نگاروں اور جغرافیہ کے عالموں سے بھی استفادہ کیا ہے۔ اس کی تصنیف **احسن التقاسیم** اُس عہد پر علمِ جغرافیہ کی سب سے اہم اور مستند کتاب تھی جس کے مقدمے میں المقدسی نے علمِ جغرافیہ میں عربوں کی خدمات کا جائزہ بھی لیا ہے اور اس موضوع پر کام کرنے والے بعض مصنفوں پر نقد ونظر اور جرح بھی کی ہے۔ پھر وہ اپنی کتاب کی خصوصیات اور اُس کا دائرۂ کار بتاتا ہے۔ اِس کتاب کی تالیف کے دوران حقائق کی جمع آوری میں جو دشواریاں پیش آئیں، اُن کا تذکرہ کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ: ''یہ سب معلومات میں نے ملکوں ملکوں سیاحت کرکے، اسلامی علاقوں میں گھوم پھر کر، وہاں کے علما سے ملاقاتیں کرکے، قاضیوں کی عدالت اور فقیہوں کے حلقۂ درس میں بیٹھ کر، ادیبوں، قاریوں، اور محدثوں سے بار بار مل کر، زاہدوں اور صوفیوں کی خدمت میں حاضری دے کر، واعظوں اور داستان گویوں کی مجلسوں میں جا کر حاصل کی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی وہ ہر ملک میں تجارت بھی کرتا رہا۔ وہاں کے باشندوں سے میل جول بھی رکھا، ہر بات میں بہت گہرائی تک غوروفکر کیا۔ سب اقلیموں کی مساحت کو فرسخوں میں ناپا، یہاں تک کہ میں اس میں ماہر ہوگیا۔ سب ملکوں کی سرحدوں پر میں خود گیا، اور اُن کو اچھی طرح سمجھ کر اُن کی نشاندہی کی۔ سب ممالک کی فوجی چھاونیوں میں بھی پہنچا۔ ہر مذہب کے بارے میں چھان بین کرکے اُسے سمجھا۔ ہر دیس کی زبان اور رنگ ونسل کے اختلافات معلوم کرکے اپنی کتاب میں درج کیے۔ دیہات وقصبات میں غور کرکے امتیاز کیا اور اُن کی فہرست مرتب کی۔ ہر ملک کے محاصل کی تحقیق کرکے اُن کا گوشوارہ بنایا۔''

المقدسی نے اپنی کتاب میں اِن ممالک کے رنگین نقشے بھی شامل کیے تھے جن میں تمام راستوں کو سرخ لکیروں سے دکھایا تھا، ریگستانوں کا رنگ ہلکا پیلا، سمندروں کا سبز، مشہور دریاؤں کا نیلا اور پہاڑوں کا بھورا رکھا تھا، تاکہ خاص و عام سب ان کو آسانی سے سمجھ لیں۔ مگر افسوس ہے کہ یہ سب نقشے ناپید ہوگئے۔ ڈی غوئے نے متعدد قلمی نسخوں سے مدد لے کر **احسن التقاسیم** کو ایڈٹ کیا ہے۔ اُسے کسی بھی مخطوطے میں یہ نقشے نہیں ملے۔ اگر یہ دستیاب ہوجاتے تو فنِ جغرافیہ کا نہایت بیش قیمت اور قدیم ترین سرمایہ ہوتے۔ ان سے بہت سے شہروں کے پرانے نام اور اُن کا محلِ وقوع بھی سمجھ میں آتا۔ جو نام اب تبدیل ہوگئے ہیں یا جو شہر بالکل مٹ چکے ہیں، اُن کے بارے میں بھی بیش بہا معلومات حاصل ہوجاتیں۔

مستشرق گلڈمیسٹر [Gildmeister] کا خیال ہے کہ المقدسی اپنی وسعتِ نظر اور کثرتِ مشاہدات کے اعتبار سے اُس عہد کے تمام جغرافیہ داں عالموں میں ممتاز ہے۔ اسپرنگر [Sprenger] کہتا ہے کہ جس طرح المقدسی نے سب ملکوں کی سیاحت کی ہے اُس طرح کسی اور نے نہیں کی، نہ کسی نے ایسا معلومات کا ذخیرہ فراہم کیا نہ اُس کی طرح سلیقے سے اُن معلومات کو پیش کیا ہے۔

المقدسی نے اپنی کتاب کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے جزو میں وہ

ممالکِ عرب مثلاً عراق، شام، مصر، مراکو وغیرہ کا تذکرہ کرتا ہے، تو دوسرے حصے میں عجمی ملکوں کا ذکر ہے جن میں مشرق سے مراد وسط ایشیا ہے۔ پھر دیلم، خوزستان، فارس، کرمان، اس کے بعد وہ ہندستان کے بارے میں بیان کرتا ہے۔ المقدسی نے جن شہروں کے نام لکھے ہیں اُن میں سے زیادہ تر اب یا تو مٹ چکے ہیں یا اُن کے نام بالکل بدل گئے ہیں، یا اُن کا محلِ وقوع تبدیل ہو چکا ہے۔ اس لیے اب المقدسی کے بتائے ہوئے ناموں سے شہروں کا سراغ لگانا نہایت دشوار کام ہے۔

وہ کہتا ہے کہ" کچھ لوگوں کا بیان ہے کہ آدم علیہ السلام کی قبر مسجد خیف کے منارے کے پاس ہے۔ دوسرے لوگ کہتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قبر کے پاس ہے اور بعض نے یہ کہا ہے کہ وہ تیہ یعنی صحرا میں ہے، مگر کچھ لوگ اُس کا ہندستان میں ہونا بھی بیان کرتے ہیں۔" سندھ کے بیان میں وہ لکھتا ہے کہ یہاں سونا ہے، تجارت ہے، جڑی بوٹیاں ہیں، آلات اور مشینیں ہیں، چاول، کیلے، کھجوریں خوب کثرت سے پیدا ہوتی ہیں اور سستی ملتی ہیں۔ یہاں عدل و انصاف بھی ہے۔ شہر بڑے بڑے ہیں اور اُن میں امن و امان ہے، یہ سمندر کے کنارے واقع ہے اور اس سرزمین کو ایک دریا سیراب کرتا ہوا گزرتا ہے۔ چاروں طرف گلستان ہے، دریا شاندار ہے، آب و ہوا اچھی ہے، مگر علما کم ہیں، جو ہیں اُن تک پہنچنا دشوار ہے۔ راستے میں بڑے میدان اور دریا حائل ہیں۔ کرمان اور مکران کے بعد المقدسی نے سندھ کا ذکر کیا ہے پھر ویہند کا نام لیتا ہے۔ ملتان اور قنوج کا ذکر کرتا ہے۔ اس علاقے میں وہ خراسان کی سرحد تک خوب گھوما ہے۔ یہاں کے لوگوں میں گھل مل کر رہا ہے۔ اُن سے طرح طرح کے سوالات کر کے نئی نئی معلومات حاصل کی ہیں۔ یہاں اُس کے راویوں میں ایک نام ابراہیم بن محمد الکرخی کا ملتا ہے، جن سے اُس نے بہت سی معلومات حاصل کی ہیں۔ سندھ میں وہ منصورہ اور دیبل کا ذکر کرتا ہے۔ اس کے علاوہ زمدریج، کدار، مایل، تنکلی، جیسے نام ملتے ہیں جن کی شناخت اب بہت دشوار ہے۔ ہندستا۔۔ کر ،دوسرے شہروں میں وہ قامہل، کھمبایت، سوبارہ، سندان، صیمور، جندرور، اسمد وغیرہ کے نام لیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ" ایک عالم شیراز اور اہواز میں قصہ گوئی کرتا تھا اور اپنے زہد کے لیے بھی مشہور تھا، وہ ہندستان کے ان شہروں میں مدت تک رہا تھا اور ان کے حالات سے خوب واقف تھا۔ اُس سے میں نے سوال کیا کہ ان شہروں کے بارے میں ایس[illegible] ر گویا میں انھیں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں۔ اسی طرح ابوالہیثم نیشاپوری کے اصحاب میں سے ایک سے معلومات حاصل کیں جو ان علاقوں میں خوب سیاحت کر چکا تھا۔ اس نے بھی دسند، ودھان، ہتر، نوج لوار، سان قوج وغیرہ شہروں کے بارے میں مجھے بتایا۔ ان میں قنوج اور اُس کے نواح میں قندار آباد، کھار، بارو، دجین [اُجین] وغیرہ شامل تھے۔

منصورہ کے لیے المقدسی کہتا ہے کہ وہ" دمشق کی طرح ہے۔ مکان لکڑی اور مٹی سے بنے ہیں۔ جامع مسجد پتھر اور مسالے سے تعمیر ہوئی ہے، اور جامع عمان کی طرح وسیع ہے۔ اس شہر کے چار دروازے ہیں باب توران، باب البحر، باب سندان اور باب ملتان۔ دریا اس شہر کو گھیرے میں لیے ہوئے ہے۔ یہاں علم کا چرچا ہے، آبادی کثیر ہے، لوگ نیک اور ذہین ہیں، آب و ہوا معتدل ہے، سردی ہلکی پڑتی ہے، بارش خوب ہوتی ہے، بھینسیں موٹی تازی ہیں، باشندے مہران ندی کا پانی پیتے ہیں۔ جامع مسجد بازاروں کے بیچ میں واقع ہے۔ یہاں کی رسمیں اہلِ عراق سے مشابہ ہیں۔ لوگوں میں نرمی اور اخلاق ہے، گرمی سخت ہوتی ہے، مکھی بہت ہیں۔"

دیبل کے چاروں طرف تقریباً سو دیہات ہیں۔ باشندے سب تجارت کرتے ہیں۔ اُن کی زبان عربی اور سندھی ہے۔ دیسند منصورہ سے بھی بڑا شہر ہے۔ اس میں دلکش باغ ہیں، گہری نہریں ہیں، بارش خوب ہوتی ہے، پھل خوش ذائقہ اور درخت گھنے سایہ دار ہیں۔ نعمتیں ظاہر ہیں، قیمتیں سستی ہیں، دودھ اور روٹی کے سستا ہونے کی تو بات ہی مت پوچھو۔"

" قنوج بھی بڑا شہر ہے۔ یہاں گوشت کثرت سے ملتا ہے۔ پانی بھی وافر مقدار میں ہے۔ چاروں طرف باغ ہیں۔ باشندے حسین ہیں۔ پانی خوش ذائقہ ہے۔ شہر کشادہ ہے، تجارت نفع بخش ہے۔ کیلے سستے ہیں، گرمی سخت ہوتی ہے۔ آٹا کم ہوتا ہے۔ زیادہ تر چاول کھائے جاتے ہیں۔ لوگ پاجامہ پہنتے ہیں۔ مکان ایک منزلہ ہیں۔ یہاں سے پہاڑ کا فاصلہ چار فرسخ ہے۔ دریا شہر کے بیچ سے گزرتا ہے۔ یہاں علما اور درویش کثرت سے ہیں۔ ملتان بھی منصورہ کی طرح ہے مگر اس سے آبادی میں زیادہ ہے۔ پھل زیادہ پیدا نہیں ہوتے مگر سستے ہیں۔ ایک درہم میں تین من روٹی مل جاتی ہے۔ یہاں کے باشندے زنا نہیں کرتے، شراب نہیں پیتے، جو ایسا کرے اُسے قتل کر دیا جاتا ہے یا سخت سزا دیتے ہیں۔ تجارت میں جھوٹ نہیں بولتے، ناپ تول میں بے ایمانی نہیں کرتے۔ پردیسیوں سے محبت کرتے ہیں، اکثر باشندے عربی نسل کے ہیں، بادشاہ عادل ہے۔ کوئی عورت زیب و زینت کے ساتھ بازار میں نہیں نکلتی، نہ کوئی شخص کسی عورت سے اعلانیہ بات چیت کرتا ہے۔ یہاں کا پانی مزے دار ہے۔ زندگی پُرلطف ہے۔ فارسی زبان سمجھی جاتی ہے۔ تجارت خوب ہوتی ہے۔ لوگوں کی صحت عام طور پر اچھی ہے۔ گھر تنگ ہیں، ہوا گرم اور خشک ہے۔ لوگوں کے رنگ کالے یا گندمی ہیں۔ منصورہ سے کھمبایت کے بنے ہوئے نفیس جوتے، ہاتھی اور ہاتھی دانت، بہترین مصنوعات اور جڑی بوٹیاں عرب دنیا کو برآمد کی جاتی ہیں۔ یہاں کا آم بہت لذیذ ہوتا ہے۔ ملتان کے ایک مندر کا وہ ذکر کرتا ہے کہ" اس میں ایک بڑا بت انسان کی شکل کا ہے،

اینٹ اور مسالے سے بنی ہوئی ایک کرسی پر بیٹھا ہے۔ اُسے لباس اس طرح پہنایا گیا ہے کہ وہ سرخ سنجاب کا معلوم ہوتا ہے۔ اس دیوتا کی صرف دو آنکھیں چمکتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ یہ دراصل دو ہیرے ہیں جو اُس کی آنکھوں میں جڑے ہیں، سر پر سونے کا تاج رکھا ہے اور اُس کے دونوں ہاتھ زانوؤں پر دھرے ہیں، انگلیاں کھلی ہوئی ہیں۔" شہروں کے درمیانی فاصلے بھی المقدسی نے بتائے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ "منصورہ سے دیبل چار منزل، منصورہ سے ملتان بیس منزل، ملتان سے غزنین اسّی فرسخ ہے۔ ملتان سے منصورہ کے راستے میں جابجا دیہات ہیں، عمارتیں بھی ملتی ہیں۔ فاصلہ ایک سو چالیس فرسخ ہے۔" یہ خلاصہ اُس بیان کا ہے جو چوتھی صدی ہجری میں ایک عرب جغرافیہ داں نے مختلف ملکوں کی سیر کر کے بیان کیا ہے۔ اِسی میں برِّصغیر اور ہندستان کے بارے میں بہت سی دلچسپ اور اہم باتیں آگئی ہیں۔ ان مؤرخوں کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ سنترہ ہمارے برِّصغیر سے عرب کی طرف گیا تھا، وہاں اس کی کاشت بھی کی گئی، مگر آب و ہوا موافق نہ تھی، اس لیے اس میں مٹھاس اور رنگ پیدا نہ ہوسکا۔ یہاں کا بنا ہوا کپڑا، جواہرات، مسالے، دوائیں، گینڈے کے سینگ، خوشبوئیں، عود، طباشیر، پان اور تاڑی کے علاوہ غلے میں گیہوں، چاول اور دالیں بھی عرب دنیا کو جاتی تھیں۔ اسلامی تاریخ میں خلافتِ عباسیہ کا زمانہ علوم و فنون میں غیر معمولی پیش رفت کا زمانہ رہا ہے۔ اُس وقت مختلف علوم میں جو کتابیں لکھی گئیں، وہ آج تک بنیادی ماٰخذ کا کام دے رہی ہیں۔ اُن کو نظر انداز کر کے اسلامی ثقافت کی کوئی تاریخ لکھنا ممکن نہیں۔ خلافتِ عباسیہ 750ء سے 1258ء تک تقریباً 508 سال رہی اور اس زمانے کو چار حصوں میں تقسیم کردیا گیا ہے، ہر دور تقریباً سوا سو سال کا ہے۔ چوتھے اور آخری دور میں اگرچہ خلافت کمزور ہوچکی تھی اور طوائف الملوکی کا زمانہ آگیا تھا مگر ابھی علوم و فنون پر زوال نہیں آیا تھا بلکہ یہ عہدِ زوال ہی علوم کے شباب کا زمانہ کہا جاسکتا ہے۔ اس زمانے میں دوسرے علوم کے ساتھ تاریخ اور جغرافیہ کے موضوعات پر بھی شاندار کام ہوئے۔ جن علمانے علمِ جغرافیہ میں اہم کتابیں لکھیں اُن میں ابوعبید البکری، ہیں جو مرسیہ [اندلس] کے باشندے تھے۔ اُن کی کتاب **مُعجم ماستعجم** عرب قبائل کے حالات پر مستند مانی جاتی ہے۔ یہ 1876 میں گوٹنجن سے چھپی تھی، پھر مصطفیٰ السقانے **لجنة التاليف و الترجمة** [مصر] سے اس کا نیا ایڈیشن مزید تحقیق کے ساتھ شائع کیا۔ البکری کا انتقال 487ھ میں ہوا تھا۔

دوسرا اہم جغرافیہ داں شریف الادریسی ہے۔ اُس نے بھی قرطبہ میں پرورش پائی تھی۔ اس کی کتاب **نُزهةُ المُشتاق فی اختراقِ الآفاق** بھی ایک اہم ماٰخذ ہے۔ ادریسی کی وفات 548ھ میں ہوئی۔ ایک اور نام ابن جبیر الاندلسی [وفات 611ھ] کا بھی لیا جاسکتا ہے۔ مگر اس دور کے مؤرخوں اور جغرافیہ دانوں میں سب سے ممتاز نام ابوعبداللہ شہاب الدین یاقوت بن عبداللہ الرومی الحموی کا ہے۔ وہ اصلاً رومی تھا مگر بچپن ہی میں وہاں سے گرفتار ہوکر بغداد آیا اور یہاں ایک تاجر نے اُسے خرید کر اپنی تجارت کا حساب کتاب رکھنے میں لگا دیا تھا۔ اس تاجر کا نام عسکر حموی تھا اور وہ خود لکھنا پڑھنا نہیں جانتا تھا۔ یاقوت جب ذرا بڑا ہوا تو اُسے لکھنے پڑھنے کا شوق پیدا ہوا۔ اُس نے نحو، لغت، ادب وغیرہ میں خاصا درک حاصل کرلیا۔ اب اُس کے مالک عسکر نے اُسے دوسرے شہروں تک مال لے جانے کے کام پر لگا دیا۔ اس طرح اُسے اسلامی دنیا کے وسیع علاقوں میں جانے اور اُن سے براہِ راست واقف ہونے کا موقع ملا۔ ایک وقت ایسا آیا کہ عسکر حموی نے یاقوت کو آزاد کردیا تو اُس نے اجرت پر کتابیں نقل کرنے کا کام شروع کردیا۔ اس سے مطالعہ بھی بہت وسیع ہوگیا۔ اُس کے سابق مالک نے ایک بار پھر یاقوت کو اپنی فرم میں ملازم رکھ کر باہر بھیجنا شروع کیا۔ کچھ زمانے کے بعد جب یاقوت سفر سے واپس آیا تو دیکھا کہ اس کا مالک وفات پاچکا ہے۔ یاقوت کو اس کے ترکے میں کچھ حصہ بھی ملا جس سے اُس نے اپنی تجارت شروع کردی۔ 613ھ میں وہ دمشق پہنچا مگر وہاں اس نے ایک مناظرے میں اپنے مذہبی عقائد کا اظہار کیا تو لوگ اُس کے پیچھے پڑ گئے، اُسے وہاں سے بھاگ کر حلب میں پناہ لینی پڑی۔ حلب سے وہ خراسان آیا اور اس علاقے میں گھومتا پھرا۔ کچھ زمانہ مَرو میں کچھ نسا اور خوارزم میں گزارا۔ 616ھ میں جب چنگیز خاں نے اس علاقے کو تاخت و تاراج کیا تو یاقوت کو اپنا سب کچھ چھوڑ کر فرار ہونا پڑا۔ یہ سخت آزمائش کا زمانہ تھا، نہ اُس کے تن پر کپڑے تھے، نہ کھانے کو کچھ میسر تھا۔ بے سروسامانی کی اسی حالت میں گرتا پڑتا وہ حلب آگیا۔ اُس کا علمی ذوق ان حالات میں بھی زندہ تھا۔ اسی زمانے میں اُس نے **مُعجم البُلدان** اور **ارشاد الاریب** کے نام سے دو ایسی کتابیں لکھیں، جنھیں انسائیکلوپیڈیا کہا جاسکتا ہے۔ معجم البلدان پانچ ضخیم جلدوں میں ہے۔ اس میں اسلامی دنیا کے چھوٹے چھوٹے دیہات اور قصبات تک کی تفصیل درج ہے۔ کتاب کی ترتیب حروفِ تہجی کے اعتبار سے ہے۔ اس میں وہ ہر شہر یا جگہ کا نام لکھ کر جہاں تک ممکن ہو، یہ بتاتا ہے کہ یہ نام کیوں پڑا، اور یہ کس زبان کا لفظ ہے اور اُس زبان میں اس کا کیا مفہوم ہے؟، وہ شہر کس ملک میں ہے، اس کا محلِ وقوع کیا ہے، وہاں کا موسم کیسا ہے، پھل کون کون سے ہوتے ہیں؟ اگر کسی شاعر نے اپنے اشعار میں اُس جگہ کا نام نظم کیا ہے تو وہ اشعار بھی درج کردیتا ہے۔ اُس شہر کی کون سی چیزیں مشہور ہیں، وہاں کی ممتاز شخصیتوں کے نام بھی لکھتا ہے۔ اگر اسی نام کے دوسرے شہر بھی ہیں تو اُن کی نشاندہی کرتا ہے۔ کہیں کہیں اُس نے عوامی روایتوں اور بے سرپیر کی باتوں کو بھی قبول کرلیا ہے، مگر کتاب کا بڑا

حصہ اس کے اپنے مشاہدے، تحقیق اور مطالعے پر مشتمل ہے۔

معجم البلدان سب سے پہلے لیپزگ [Liepzig] سے 1866ء میں چھپی تھی پھر 1909ء میں مصر سے اس کا تحقیق شدہ ایڈیشن شائع ہوا جسے مشہور مستشرق ووسٹنفیلڈ [Wustenfeld] نے ایڈٹ کیا تھا۔ معجم البلدان کا ایک خلاصہ صفی الدین عبدالحق نے "**مراصد الاطلاع علی اسماء الامکنۃ والبقاع**" کے نام سے 739ھ میں کیا تھا۔ یہ بھی 1850ء میں لیون سے شائع ہو چکا ہے۔ معجم البلدان میں ہندستان اور اس کے مشہور شہروں کا بھی ذکر ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ساتویں صدی ہجری/چودھویں صدی عیسوی میں یہاں کے شہروں کا کیا حال تھا۔ ایک دشواری قدیم تاریخ اور جغرافیہ کی کتابوں میں اور ہے کہ اب اسی فیصد سے زیادہ شہروں کے نام بدل چکے ہیں یا وہ بالکل ناپید ہو گئے ہیں، عرب مؤرخ اور جغرافیہ داں ہندستانی ناموں کو اپنے عربی لہجے میں ڈھال کر کچھ کا کچھ بنا دیتے ہیں، اور بعض مقامات کے نام انھوں نے اپنی لغت میں کچھ اور رکھ چھوڑے ہیں، اس لیے ان کتابوں میں بعض مقامات کا حال پڑھتے ہوئے صحیح محل وقوع کا جاننا دشوار ہوتا ہے۔ یہ خود گہری تحقیق کا موضوع بن جاتا ہے۔ دوسرے مؤرخوں کے برخلاف یاقوت حموی ہندستان کے اندر تک نہیں آیا، اگر آیا بھی ہوگا تو خراسان کی مشرقی سرحد یا سندھ سے گزرا ہوگا۔ اس لیے وہ زیادہ تر سندھ، گجرات اور سری لنکا کا تذکرہ کرتا ہے۔ معجم البلدان کی پانچ جلدیں ڈھائی ہزار سے زیادہ صفحات پر مشتمل ہیں اور ان میں ہندستان کے درجنوں مقامات کا بیان ہوا ہے۔ بعض کا ذکر بہت مختصر اور بعض کا قدرے تفصیل سے ہے۔ اتنی ضخیم کتاب سے بطور نمونہ صرف ایک دو ناموں کو بیان کیا جا سکتا ہے: سرندیپ کے لیے وہ کہتا ہے کہ دیپ ہندستانی زبان میں بڑے جزیرے کو کہتے ہیں، اور سرن کے معنی مجھے معلوم نہیں۔ اس کے بعد آگے سیلون (سری لنکا) کا بیان ہے اور کہتا ہے۔ یہ بہت بڑا جزیرہ ہے، یہاں کئی بادشاہ ہیں، اور ہر ایک خودمختار ہے۔ اس کے پاس جو سمندر ہے، وہ شلاہت کہلاتا ہے۔

صیمور غالباً گجرات میں تھا، اسے وہ سندھ سے ملا ہوا علاقہ بتاتا ہے۔ یہاں کا راجا بلہرا ہے جس کی مملکت کا رقبہ بہت وسیع ہے۔ اس کی راجدھانی مونکیر ہے۔ صیمور اور کھمبایت میں مسلمان بھی بڑی تعداد میں آباد ہیں۔ ایک شاندار جامع مسجد بھی ہے جس میں جمعہ کے دن بڑا مجمع ہوتا ہے۔ صیمور اور کھمبایت میں راجا بلہرا کی طرف سے ایک مسلمان ہی حکومت کرتا ہے۔ اس سے یاقوت کی مراد غالباً یہ ہے کہ مسلمانوں کے مسائل و مقدمات شریعت کے مطابق فیصلہ کرنے کے لیے مسلمان قاضی مقرر تھا، ممکن ہے اسے کچھ انتظامی اختیارات بھی دیے گئے ہوں۔ ایک عجیب بات وہ یہ کہتا ہے کہ طمہرث نامی بادشاہ نے ہندستان کے کسی پہاڑ پر ایک شہر بسایا تھا جس کا نام اوق تھا۔ یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ اوق شہر کا نام ہے یا پہاڑ کا۔ مگر اس سے یہ تو ثابت ہوتا ہے کہ Hill Station بنانے کا کام انگریزوں سے بہت پہلے اس ملک میں شروع ہو چکا تھا۔ لاہور اور ملتان کا حال اس نے تفصیل سے لکھا ہے۔ لاہور میں علوم اسلامیہ کے جو ممتاز علما ہوئے ہیں یا اس کتاب کی تصنیف کے وقت موجود تھے، ان کا تذکرہ بھی کرتا ہے۔ اسی طرح وہ سندھ کا حال لکھتا ہے۔ مگر اس میں یہ روایت بھی درج کر دی ہے کہ سند اور ہند دو بھائی تھے جو بوقیر بن یقطین بن حام بن نوح کی اولاد تھے۔ ان میں سے سند کی اولاد سندی کہلاتی ہے۔ ظاہر ہے اس روایت پر اسرائیلیات کی چھاپ لگی ہوئی ہے اور یہ تاریخ نویسی کا وہ رویہ ہے جسے Biblical Method of Historiography کہا جاتا ہے۔ سندھ کے شہروں میں وہ المنصورہ اور دیبل کا تذکرہ کرتا ہے، اور کہتا ہے کہ ملتان المنصورہ سے آدھا ہے۔ وہ عبداللہ بن سوید تمیمی کے تین اشعار بھی درج کرتا ہے جن میں سندھ کا نام آیا ہے اور یہ بھی بتاتا ہے کہ سندھ نام کے دو مقامات اندلس میں اور ایک خراسان میں بھی ہے۔

غرض یہ عظیم جغرافیہ داں اور مورخ 1178ء میں پیدا ہوا تھا اور صرف اکیاون سال کی عمر میں ایسا کام کر گیا جس کا آج تک جواب نہیں۔ ہم جدید ترین وسائل اور سہولتوں کے ہوتے ہوئے بھی وہ کام ایسے سلیقے سے شاید نہ کر سکیں جو اُس نے شدید سیاسی بحران اور رستاخیز کے زمانے میں رہ کر کر لیا۔ اس نے اپنی وفات سے پانچ سال قبل 20۔صفر 621ھ/13۔مارچ 1224ء کو معجم البلدان کی تکمیل حلب میں بیٹھ کر کی تھی اور اسی شہر میں 20۔رمضان 626ھ/12۔اگست 1229ء کو اُس نے وفات پائی۔

برصغیر اور عرب دنیا کے قدیم تعلقات پر اردو اور انگریزی میں تو کچھ لکھا بھی گیا ہے اور بعض اہم عربی کتابوں کے تراجم بھی انگریزی میں ہوئے ہیں مگر اب اس کی ضرورت ہے کہ ان تمام بنیادی مصادر کو نئے سرے سے دیکھا جائے اور ہندستانی زبانوں میں ان کے منتخب حصے ترجمہ کیے جائیں تاکہ ان کی مدد سے تاریخ کی نئی تدوین کی جا سکے جس کا بڑا حصہ سامراجی حکومتوں نے اپنے سیاسی مقاصد کے حصول کے لیے بگاڑ کر رکھ دیا ہے۔ ان قدیم عرب مورخوں اور سیاحوں کی یہ خصوصیت قابل ذکر ہے کہ ان میں سے کسی کا لب و لہجہ اعتراض یا تلخی یا حقارت کا نہیں ہے، یہ سب ہی اپنے اپنے انداز میں ہندستان کے گن گاتے ہیں۔

Retd. Professor of Arabic, Delhi University
837, Batla House,
Okhla, Jamia Nagar,
New Delhi-110025

□□□

عبدالستار دلوی

مشترکہ تہذیب کے علمبردار — تیج بہادر سپرو

ہندستان میں سیاست اور دانشوری میں بہت قرب رہا ہے۔ مہاتما گاندھی، تلک، گوکھلے، پنڈت نہرو، مولانا آزاد، رادھا کرشنن یا ڈاکٹر ذاکر حسین یہ وہ شخصیتیں ہیں جنھوں نے قومی سیاست کو دانش ورانہ وقار بخشا۔ سرتیج بہادر سپرو کا شمار بھی ان شخصیتوں میں ہوتا ہے جن پر ہندستان ہمیشہ فخر کرتا رہے گا۔

سرتیج بہادر سپرو اپنے زمانے کے جید قانون داں، ادیب، مفکر اور ماہر تعلیم تھے جو اپنی اردو دوستی کے لیے بھی شہرت رکھتے ہیں۔ تیج بہادر سپرو کا تعلق کشمیری برہمن خاندان سے تھا، جس نے ہندستان کی مشترکہ قومی تہذیب کی آبیاری کی ہے اور اردو زبان و ادب کو پروان چڑھانے میں ایک اہم رول ادا کیا ہے۔

سرتیج بہادر سپرو مزاجاً ایک دانشور اور وسیع الذہن انسان تھے، ان کی وسیع المشربی کو آگرہ کے قیام کے زمانے میں مزید جلا ملی۔ وہ آگرہ کالج کے پروفیسر اینڈریوز کے افکار و خیالات سے بہت متاثر ہوئے۔ ہندستانی سیاست میں یہ ان کی ذہنی تربیت کی ابتدا تھی، جس پر وہ ہمیشہ قائم رہے۔ جب سپرو آگرے میں تھے، اسی زمانے میں انڈین نیشنل کانگریس نے ہندستانی سیاست میں ایک اہم رول ادا کرنا شروع کر دیا تھا۔ کانگریس کی پالیسی لبرلزم (Liberalism) کے فلسفۂ سیاست پر قائم تھی۔ جمہوری طریقے اور دستوری ذرائع استعمال کرنا کانگریس کا اہم مطمح نظر تھا۔ سپرو نے ان خیالات اور اصولوں کو پوری طرح اپنا لیا۔ وہ اس عہد کے سیاسی رہنماؤں مثلاً ڈبلیو. سی. بنرجی، دادا بھائی نوروجی، ونشا واچھا، سریندر ناتھ بنرجی، پنڈت ایودھیا ناتھ وغیرہ سے بہت متاثر ہوئے۔ وہ ابتدا ہی سے ہند اسلامی تہذیب و تمدن سے بھی متاثر تھے۔ ان کے دادا سرسید احمد خاں کے قریبی دوستوں میں سے تھے۔ تیج بہادر، اپنے دادا کے ساتھ سرسید سے ملے تھے اور وہیں ان کی ملاقاتیں دیگر مسلم دانشوروں سے بھی ہوئیں۔

سرتیج بہادر سپرو اردو اور فارسی کے عالم تھے۔ 1943 میں ایرانی ثقافتی مشن ہندستان آیا تو وہ لوگ سپرو کی فارسی دانی دیکھ کر حیران رہ گئے۔ وہ عرصے تک انجمن ترقی اردو، دلی کے صدر بھی رہے اور اردو زبان کے قومی کردار کو عوام و خواص میں اپنی تقریروں کے ذریعے عام کرنے اور اردو کے بارے میں غلط فہمیاں پیدا کرنے والوں کی پھیلائی ہوئی بدگمانیاں دور کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ موجودہ ہندستانی تہذیب و ثقافت کی تشکیل میں ہندوازم کے ساتھ اسلامی اور مغربی عناصر بھی کارفرما رہے ہیں۔ ان کا یہ بھی ایقان تھا کہ مشترکہ قومی تہذیب کی ترویج و ترقی ہی میں ہندستان کے تابناک مستقبل کا راز پوشیدہ ہے۔

سرتیج بہادر سپرو کو اپنے ملک اور اس کے تہذیبی ورثے سے بے پناہ محبت تھی۔ وہ اردو کو قومی وحدت کا نمونہ سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اردو ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ میراث ہے اور لسانی اور تہذیبی اعتبار سے دلوں کو جوڑنے کا موثر وسیلہ ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

"اردو زبان ہم ہندو مسلمان دونوں کو اپنے آبا واجداد سے ایک مشترکہ اور مقدس ترکے کی حیثیت سے ملی ہے جو قطعاً ناقابلِ تقسیم ہے اور یہی وہ زبان ہے جو قریب قریب ہر صوبے میں کم و بیش بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ مجھے یہ دیکھ کر بڑا قلق ہوتا ہے کہ تقریباً چالیس پچاس سال سے یہ کوشش ہو رہی ہے کہ عوام غیر فطری طور پر ایک بناوٹی زبان سیکھیں اور اس زبان سے کنارہ کشی اختیار کر لیں جو فطری طور پر ہندوؤں اور مسلمانوں کے میل جول سے پیدا ہوئی ہے اور ان کی آپس کی رواداریوں اور قربانیوں کا نتیجہ ہے۔ اردو جو قطعاً وقت کی فطری ضرورت سے پیدا ہوئی ہے، یہ مٹائی نہیں جا سکتی۔ اگر چند مٹھی بھر آدمی فرقہ وارانہ سوال پیدا کر کے اکثریت کے زعم میں اسے مٹانا چاہتے ہیں تو یہ سودائے خام ہے۔ اگر مسلمانوں نے اردو کی اشاعت میں بہت کچھ کیا ہے تو ہندوؤں نے بھی کسی حالت میں اردو کو ترقی دینے میں کمی نہیں کی...... بعض لوگوں کی طرف سے کہا جاتا ہے کہ ہم وہ زبان استعمال کریں جو دیہاتوں میں عام طور پر بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ لیکن جب ہر گاؤں اور قصبے کی مقامی بولی اور لب و لہجہ میں فرق ہے اور اس طرح دیہاتی اور شہری محاوروں اور الفاظ میں فرق ہے تو آپ کہاں تک ان کی تقلید کریں گے۔"

سپرو اردو کی لسانی و تہذیبی اہمیت کے ساتھ کثیر لسانی ملک کی ضروریات سے بھی واقف تھے، وہ اردو کی ادبی اور علمی حیثیت اور اس کے محاسن سے بخوبی واقف تھے، لیکن اسی کے ساتھ وہ چاہتے تھے کہ یہ زبان ایک عام فہم زبان ہو اور بے جا تصنع سے دور رہے۔ وہ اردو پر فارسی عربی کے اثرات کو ایک تاریخی عمل سمجھ کر قبول کرتے تھے لیکن غیر ضروری طور پر فارسی اور عربی الفاظ کی درآمد سے ناخوش تھے۔ عثمانیہ یونی ورسٹی نے اپنا ذریعۂ تعلیم اردو کو بنایا تھا۔ کسی ہندستانی زبان کو اعلا تعلیم کے لیے استعمال کرنے کا یہ پہلا کامیاب تجربہ تھا۔ اس ضرورت کے تحت دارالترجمہ میں بے شمار کتابیں اردو میں منتقل ہوئیں۔ ترجمے کے اس کام کو انھوں نے نہ صرف پسند کیا بلکہ اس سے استفادہ بھی کیا، لیکن انھیں اس بات پر اعتراض تھا کہ کہیں کہیں غیر ضروری طور پر تراجم کی زبان مشکل ہوگئی ہے اور فارسی اور عربی الفاظ کا بے جا استعمال ہوا ہے۔ انھوں نے یونیورسٹی کے اپنے کانوکیشن اور ایڈریس میں یونی ورسٹی کے ارباب حل و عقد کی اس طرف توجہ دلائی تھی۔

زبانیں ایک سے زیادہ سطحوں پر استعمال ہوتی ہیں۔ بول چال کی زبان علمی زبان سے مختلف ہوتی ہے۔ علمی اسالیب کے لیے ہندی اور دیگر آریائی زبانیں سنسکرت کی طرف جھکتی ہیں اور اردو اپنے مخصوص حالات اور مزاج کی وجہ سے فارسی اور عربی کی جانب جھکتی ہے۔ سر تیج بہادر سپرو کا کہنا تھا کہ ہندستان میں ایک رابطے زبان کی حد تک اس رجحان میں نرمی اور لچک پیدا کرنا ضروری ہے۔

اقبال نے بھی خطبات مدراس میں غیر ضروری طور پر اردو میں عربی، فارسی یا ہندی میں سنسکرت الفاظ کے استعمال کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا تھا۔ یہاں سپرو اور اقبال دونوں گاندھی جی کے لسانی نظریات کی تائید کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ گاندھی جی نے متعدد بار غیر ضروری طور پر عربی اور فارسی یا سنسکرت کے الفاظ کے استعمال کو قومی زبان ہندستانی کے حق میں ضرر رساں بتایا تھا۔ 23رجون 1936 کے ہریجن سیوک میں انھوں نے لکھا تھا:

''سیدھے سادے چالو شبدوں کی جگہ سنسکرت شبد رکھنے یا شبدوں کو سنسکرت کا روپ دینے کا بناوٹی طریقہ بے شک برا ہے۔'' مگر جیسا کہ سپرو نے کہا علمی زبان کی حیثیت عام بول چال کی زبان سے مختلف ہوتی ہے، اصطلاحات علم وادب کا حصہ ہیں، یہاں الفاظ یا اصطلاحوں کے استعمال کے سلسلے میں قدرے آزادی کی ضرورت برقرار رہے گی، لیکن موجودہ حالات میں ہمیں علمی اصطلاحات کے لیے فارسی اور عربی کے علاوہ مغربی زبانوں، خاص طور سے انگریزی، فرانسیسی یا جرمن زبانوں اور خود سنسکرت سے استفادے کے لیے بھی اردو زبان کے دروازے کھلے رکھنے ہوں گے تاکہ اردو کا علمی اور معنیاتی افق تابندہ سے تابندہ تر ہوتا جائے اور ابلاغ وترسیل میں کسی طرح کی رکاوٹ پیدا نہ ہو۔ یہاں پھر میں گاندھی جی کے خیال کو دہرانا چاہوں گا۔ گاندھی جی نے کہا تھا:

''ہندو مسلمانوں میں جو فرق کیا جاتا ہے، وہ بناوٹی ہے۔ ایسا ہی بناوٹی پن ہندی اور اردو بھاشا کے فرق میں ہے۔ ہندوؤں کی بولی سے فارسی شبدوں کو بالکل الگ کرنا اور مسلمانوں کی بولی سے سنسکرت کو بالکل الگ کر دینا غیر ضروری ہے۔ دونوں کا قدرتی سنگم، گنگا جمنا کے سنگم سا خوبصورت رہے گا۔''

سپرو اردو کے زبردست وکیل تھے۔ وہ اردو کو ایک ایسی زبان مانتے تھے، جو ہندوؤں اور مسلمانوں کا مشترکہ ورثہ ہے اور جس کی آبیاری ہندوؤں اور مسلمانوں نے ایک ساتھ کی ہے۔

□□□

3, AL-HILAL, BANDRA RECLAMATION, MUMBAI-400 050

جامع انگریزی-اردو لغت (حصہ اوّل تا ششم)

مدیرِ اعلا: کلیم الدین احمد

☆ محققین، مترجمین، دفتری اہل کاروں، اساتذہ، قانون دانوں، اہل علم وقلم، صحافیوں، طلبہ اور عام لوگوں کی روزمرّہ ضروریات کے لیے یکساں افادیت کی حامل یہ انگریزی اردو لغت ڈھائی لاکھ سے زائد الفاظ واصطلاحات ومعانی کا احاطہ کرتی ہے۔

☆ یہ لغت دنیا کے کسی بھی موضوع پر انگریزی الفاظ کے اردو مترادفات فراہم کرنے میں آپ کی مدد کرے گی۔

☆ تمام مروّج علوم وفنون سے متعلق انگریزی/اردو الفاظ واصطلاحات کا ایک جامع ذخیرہ۔

☆ مترادفات، محاورات اور تشریحات سے مزین اپنی نوعیت کی پہلی مستند، وقیع اور ضخیم لغت جو ویبسٹر کو بنیاد بنا کر تیار کی گئی ہے۔

☆ اردو زبان میں نئے سائنسی تصورات اور نئی علمی جہتوں کے اضافے کے ساتھ۔

☆ اکیسویں صدی کے علمی تقاضوں سے ہم آہنگ........

☆ دوسو سے زائد سائنسی وسماجی علوم وفنون پر محیط........

☆ امریکی/برطانوی انگریزی کے الفاظ کی صراحت کے ساتھ........

☆ قومی اردو کونسل کا ایک یادگار کارنامہ........ ایک تاریخی دستاویز، بڑا سائز 11.5x911۔ عمدہ کاغذ، بہترین طباعت........ کمپیوٹر شدہ کتابت مضبوط ومطلا جلد........ صفحات: حصہ اوّل (1217، قیمت: -/400)، حصہ دوم (1062، قیمت: -/600)، حصہ سوم (1091، قیمت: -/600)، حصہ چہارم (866، قیمت: -/600)، حصہ پنجم (1042، قیمت: -/600)، حصہ ششم (1012، قیمت: -/600) براہ راست طلب فرمائیں یا کسی کتب فروش سے خریدیں۔

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

تحریر: سدھا پائی
ترجمہ و تلخیص: محمد کاظم

اتر پردیش میں اردو کی صورتِ حال — تاریخی پس منظر میں

زبان کی اہمیت عوام کی ثقافت کے ایک حصے کے طور پر ساری دنیا میں تسلیم کی گئی ہے۔ آج پوری دنیا نے اقلیتوں کے اس حق کو تسلیم کرلیا ہے کہ وہ اپنی مادری زبان میں تعلیم حاصل کریں۔ ہندستان کے آئین میں اقلیتوں کے بارے میں آرٹکل 1-30 میں کہا گیا ہے: ''ہر اقلیت چاہے وہ مذہبی ہو یا لسانی، اسے یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ اپنی مرضی کے مطابق تعلیمی ادارے قائم کرے اور چلائے۔'' اسی طرح آرٹکل A 350 میں کہا گیا ہے کہ ''ہر حکومت اور ہر مقامی ادارہ پرائمری سطح پر بچوں کی تعلیم ان کی مادری زبان میں دینے کا انتظام کرے۔'' تاہم آئین کی ان دفعات کا اطلاق اردو زبان کے بارے میں نہیں کیا گیا ہے جو اس ملک میں آزادی کے بعد سے زوال پذیر ہے۔ اس مضمون میں خاص طور پر اتر پردیش میں اردو کے زوال پذیر ہونے کے اسباب پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ وہ علاقہ تھا جہاں اٹھارھویں اور انیسویں صدی میں اودھ کے نوابوں کی سرپرستی میں اس زبان کا فروغ ہوا۔ یہ عوام کی زبان بن گئی اور اس کے علاوہ عدالت اور انتظامیہ کی بھی زبان تھی۔

موجودہ ہندستان میں زبانوں اور صوبوں کے تاریخی تعلق کو خاص طور پر تسلیم کیا گیا ہے۔ وہ صوبے جو اپنی شناخت متضاد عناصر کے درمیان قائم کرنا چاہتے ہیں، کسی سرکاری زبان کا انتخاب ان کی ایک سیاسی ضرورت بن جاتی ہے، تاہم یہ بھی ہے کہ کسی کثیر لسانی سماج میں مختلف لوگوں کے درمیان انصاف پر مبنی سہولتیں فراہم کرنا عام طور پر ناممکن ہوتا ہے۔ ان حالات میں کسی زبان کا سرکاری زبان کے طور پر انتخاب عام طور پر سیاسی نتائج کا حامل بن جاتا ہے۔ یہ بات عموماً ترقی پذیر ممالک کے لیے بالکل صحیح ہے جو غلامی سے نجات کے بعد اپنی قومیت کی شناخت قائم کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ ان حالات میں اگر کسی زبان کے پاس کوئی سیاسی طاقت نہ ہو تو اکثر وہ ایک ایسا آلہ بن جاتی ہے جس کی بدولت دوسری زبانیں اقلیتوں پر اپنا تسلط قائم کر لیتی ہیں۔ اس پس منظر میں اردو اور ہندی کے درمیان غلامی کے عہد سے لے کر آزادی کے زمانے تک تعلقات پر غور کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ اردو زبان کا انحطاط آزادی کے بعد سے خاص طور پر شروع ہوا اور اس کی ایک سب سے بڑی وجہ تقسیم ملک تو تھی ہی لیکن پس منظر میں غلامی کے دور میں ہونے والی بہت سی تبدیلیاں بھی کام کر رہی تھیں۔ تحریک آزادی کا دور ایک ایسا عہد تھا جس میں سماج کے مختلف گروہ اپنی اپنی ثقافتی شناخت کے کام میں لگے ہوئے تھے اور اس شناخت کو بعد میں بطور ایک نظریہ قبول کرلیا گیا۔

تحریکِ آزادی کے دوران دو طرح کی تحریکیں چلیں ایک تو وہ جس میں پوری قوم مہاتما گاندھی کی آواز پر ایک ہو رہی تھی اور دوسری وہ چھوٹی چھوٹی علاقائی تحریکیں جن میں مختلف علاقے ایک زبان اور ثقافت کی بنا پر یکجا ہو رہے تھے۔ زبان و ثقافت کی تحریکیں اور نوآبادیاتی پالیسی نے مل کر اس شناخت کو اور مضبوط کرنے میں کافی تعاون دیا۔ یو پی میں دو خاص طرح کی تحریکیں چلیں جن کے اثرات نوآبادیاتی عہد کے بعد زیادہ واضح ہوئے۔ ایک تو ہندی اور اردو زبانوں کا دو الگ الگ زبانوں کی شکل میں فروغ پانا اور دوسرے ہندی کا ایک برتر زبان کی شکل میں صوبے کی مقامی زبان بن جانا۔

ہندی — اردو زبانوں کی نوآبادیاتی عہد میں ترقی ان کی موجودہ حالت کو سمجھنے میں معاون ہوگی۔ یہ دونوں زبانیں ایک ساتھ ترقی پاتی گئیں اور ہندوؤں اور مسلمانوں کا تعلیم یافتہ طبقہ دونوں زبانوں کا استعمال کرنے لگا۔ خاص بات یہ ہے کہ یو پی میں سب سے پہلا ہفتہ وار اخبار 'بنارس اخبار' نکلا اور اس کے کچھ دنوں بعد 1855 میں ہندی میں 'سروہت کارک' نکلنا شروع ہوا جس میں ہندی اور اردو دونوں کی ملی جلی زبان استعمال ہوتی تھی۔ 1800 کے وسط آخر میں صوبے میں اردو پریس کا کافی فروغ ہوا اور بہت سے ہفتہ وار اور پندرہ روزہ اخبار مختلف جگہوں مثلاً میرٹھ، دہلی، آگرہ، لکھنؤ اور علی گڑھ سے شائع ہونا شروع ہوئے جن میں اودھ اخبار، بھارت پتریکا، شانۂ ہند وغیرہ کافی مشہور ہوئے۔ اس سلسلے میں 1861 میں ایک خصوصی مطالعہ کیا گیا اور اس میں پایا گیا کہ اردو کے زیادہ تر اخبارات کے مالکان ہندو رہے ہیں۔ جس زبان کو آج ہم ہندی کہتے ہیں، اس نے انیسویں صدی کے آخر میں فروغ پایا اور اسی کی بدولت ہندی صحافت کی ابتدا ہوئی، اور پہلا اخبار بنارس سے 'کوی واچن سدھا' شائع ہوا۔ انیسویں صدی کے ختم ہونے تک بہت سے اخبارات نکلنے شروع ہوئے جن میں الہ آباد کا 'پردیپ' کانپور کا 'برہمن' لکھنؤ کا 'دسندھرا' وغیرہ کافی مشہور ہیں۔ اس کے سبب ہندی میں ادبی کارناموں کا سیلاب آگیا اور انیسویں صدی کے وسط میں ہندی زبان کے فروغ اور تشہیر کے لیے بہت سی انجمنیں وجود میں آگئیں جیسے 'ہندی ساہتیہ سمیلن' اور بنارس کی 'ناگری پرچارنی سبھا'۔ آریہ بھاشا اور اس کے ادب کے احیا کے لیے مختلف جگہوں پر گروکل قائم کیے گئے، اس کے ساتھ ہی ہندی سمیلن کا انعقاد کیا گیا۔ اس طرح کا پہلا سمیلن 1911 میں ہوا اور اس کے بعد ہر سال پابندی سے ہوتا رہا۔ بڑے بڑے ہندو تاجر اور سرمایہ کاروں نے ہندی زبان کے فروغ

اور توسیع کے لیے بڑے پیانے پر عطیات دینا شروع کیے اور مارواڑی تاجروں نے اس زبان میں اسکالرشپ دینے کے لیے کثیر رقم عطا کی۔ ساتھ ہی ہندی کا استعمال سودیشی سے جوڑ دیا گیا تاکہ بڑے پیانے پر لوگ قومی تحریک میں شامل ہوسکیں۔ اس زمانے میں دیوناگری رسم خط کا استعمال بھی ہر جگہ کیا جانے لگا۔ بنارس کی ناگری پرچارنی سبھا نے اس نئی زبان کا سرا کھڑی بولی کی روایت سے جوڑ دیا۔ جس کی وجہ سے اردو والے مجبور ہوئے کہ وہ اپنی زبان کو ہندی سے مختلف ظاہر کرنے کے لیے اس میں بڑے پیانے پر فارسی اور عربی الفاظ کو داخل کریں۔ اس سلسلے سے اردو والوں نے آگے بڑھ کر بھاشا کی سبھی روایات کو متروک قرار دے دیا، جب کہ دیوناگری رسم خط میں لکھی جانے والی ہندی نے بھاشا کی روایت کو اپنی روایت کہہ کر گلے لگالیا۔

اس زمانے میں حکومت کی لسانی پالیسی بھی ان دونوں زبانوں کو الگ الگ زبان قرار دینے میں کافی معاون ہوئی۔ 1882 میں قائم کیے گئے 'ہنٹر کمیشن' نے ہندستانی زبانوں کو حکومت کے ذریعے روزگار دیے جانے سے جوڑ دیا۔ اس کی وجہ سے اور بھی ہندی اور اردو کے ادارے اور انجمنیں وجود میں آگئے جو سرکار سے مانگ کرنے لگے کہ ان کی زبان کو تسلیم کیا جائے۔ بیسویں صدی کی ابتدا میں حکومت نے ملک میں لسانی جائزے کے لیے 'گریرسن کمیشن' قائم کیا۔ اس نے تاریخی طریقہ کار اپناتے ہوئے شمالی ہند میں ان دو بڑی زبانوں کی جڑ کو سنسکرت اور عربی فارسی سے جوڑ دیا۔ اس جائزے کے دوران ہندی اور صوبے کی دوسری علاقائی زبانوں، برج اور اودھی میں تفریق شروع ہوگئی لیکن 'ہندی ساہتیہ سمیلن' اور الہ آباد یونی ورسٹی کے شعبۂ ہندی نے بہت کامیابی کے ساتھ دعوا کیا کہ ہندی ہی ان علاقائی زبانوں کی ماں ہے اور یہ زبانیں نہیں بلکہ بولیاں ہیں۔ اس کی وجہ سے ان بولیوں کا اپنا تشخص کم ہوگیا اور یہ ہندی میں ضم ہوگئیں اور انھی کی بدولت ہندی شمالی ہند کی سب سے بڑی زبان قرار دے دی گئی۔

اس پس منظر میں انگریز حکومت کی امتیازانہ پالیسی کو سمجھا جاسکتا ہے۔ 2 مارچ 1898 کو 17 مشہور ہندو نمائندوں نے لیفٹیننٹ گورنر سے ملاقات کرکے انھیں عرض داشت پیش کی کہ اتر پردیش کی عدالتوں اور سرکاری دفتروں میں دیوناگری رسم خط کا استعمال کیا جانا چاہیے۔ اگر چہ اس وقت گورنر نے نہ تو ان سے کوئی وعدہ کیا اور نہ اس پر کوئی کارروائی کی لیکن اچانک 20 اپریل 1900 کو سرکار نے اس عرض داشت پر عمل کرنے کا فیصلہ کرتے ہوئے نوٹی فکیشن جاری کردیا کہ اب عدالتوں میں ہندی جو دیوناگری رسم خط میں لکھی جاتی ہے، اس کا بھی استعمال فارسی رسم خط کے ساتھ ساتھ کیا جائے گا۔

حکومت بہت سے معاملات میں ہندو مسلم مفاہمت سے اس زمانے میں پریشان تھی اور اسے اندیشہ ہوگیا تھا کہ یہ دونوں مل کر اس کے خلاف زبردست تحریک چلائیں گے، اس لیے اس نے ان دونوں میں پھوٹ ڈالنے کی ضرورت محسوس کی اور اس میں وہ کامیاب بھی ہوگئی۔ اس وقت اتر پردیش کے لیفٹیننٹ گورنر انتھونی نے جو جملہ کہا تھا وہ خاص اہمیت کا حامل ہے۔ اس نے کہا تھا کہ اگر چہ ابھی ہندی اردو کی جگہ نہیں لے رہی ہے کیوں کہ ابھی اس کا صحیح وقت نہیں آیا ہے اور ایسا کرنے میں ابھی پریشانی ہوگی۔ لیکن اسی کی بدولت مسلمانوں کے ذہنوں میں شکوک وشبہات نے جگہ لے لی۔ سرکار کے اس موقف کا براہ راست اثر مسلمانوں پر پڑنا تھا چونکہ اردو ایک زمانے سے شمالی ہند میں عدالتوں اور انتظامیہ کی زبان بنی ہوئی تھی اور اسی وجہ سے بہت سے مسلمانوں نے برٹش انتظامیہ میں ملازمت پائی تھی۔ اس دوران کیے گئے ایک مطالعے میں پایا گیا کہ 1887 میں مقامی لوگوں کو حکومت نے جو عہدے دیے تھے ان میں سے 30 فیصد پر مسلمان فائز تھے۔ اس کے علاوہ لکھنؤ بار اور الہ آباد ہائی کورٹ میں بھی بہت سے مسلمان مشہور وکلا تھے۔ اسی زمانے میں یوپی کے تعلقہ داروں نے شکریہ ادا کرنے کے لیے جن جلسوں کا انعقاد کیا تھا اس سے دونوں فرقوں میں تفریق اور زیادہ گہری ہوتی گئی۔ مسلمان رہنماؤں نے علی گڑھ، لکھنؤ، بدایوں اور میرٹھ میں اس کی مخالفت میں بہت سے مظاہرے کیے جنھیں سرکار نے سختی سے کچل دیا۔ حکومت کی ایک فریق کی حمایت کرنے کی پالیسی کی وجہ سے ان دونوں میں اختلافات مزید بڑھتے چلے گئے۔

آزادی کے وقت کانگریس پارٹی نے جو کردار ادا کیا وہ بھی بہت اہم ہے۔ نہرو اور گاندھی دونوں اس بات کے حامی تھے کہ 'ہندستانی' ہندستان کی سرکاری زبان ہو۔ اس کی وجہ سے ان دونوں زبانوں کی اہمیت آزادی کے بعد بڑھ جاتی کیونکہ 'ہندستانی' کسی بھی رسم خط میں لکھی جاسکتی تھی۔ بہت پہلے پنڈت نہرو نے اپنی سوانح حیات میں لکھا تھا کہ مجھے اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ ہندستانی چاہے کیسی بھی ہو، یہی ہندستان کی سرکاری زبان بننے والی ہے۔ مہاتما گاندھی اور نہرو کی قیادت میں کانگریس پارٹی نے بھی اسی ہندستانی زبان کے لیے اپنی حمایت پیش کی۔ 19 ستمبر 1938 کو کانگریس ورکنگ کمیٹی نے ایک ریزولیوشن پاس کرکے کہا تھا کہ "اب کانگریس پارٹی کی ساری کارگزاری عام طور پر ہندستانی زبان میں ہی کی جائے گی۔ انگریزی اور دوسری صوبائی زبانوں کا استعمال مقرر صرف اس وقت کرسکتا ہے جب وہ ہندستانی زبان نہ جانتا ہو یا صدر اسے اس کی اجازت دیں۔"

تاہم آزادی اور تقسیم ہند کے فوراً بعد کانگریس پارٹی کے بہت سے ممبروں نے زور وشور سے اس بات کی مانگ شروع کردی کہ ہندی ہی سرکاری زبان ہو اور نہرو کو ان کے سامنے مجبور ہونا پڑا۔ دستور ساز اسمبلی کے مباحثے ظاہر کرتے ہیں کہ بہت سے ممبران کی دلچسپی اس بات میں تھی کہ اقلیتوں کی اپنی زبان کے تحفظ کے لیے مدد کی جائے لیکن دستور ساز اسمبلی نے بالآخر یہ فیصلہ کرلیا کہ ہندی زبان ہی 'راج بھاشا' ہوگی۔ ہندی کے بہت سے جوشیلے حمایتیوں، خصوصاً

یو پی کے سی بی گپتا، پرشوتم داس ٹنڈن اور سمپورنا نند نے اسے 'راج بھاشا' کی جگہ 'راشٹر بھاشا' بنانے پر زور دیا۔ وہ ہندستانی کو قومی زبان بنانے کے نظریے سے متفق نہیں تھے کیونکہ ان کا خیال تھا "یہ بازار کی زبان ہے، اس لیے ملک کے معاملات چلانے کے لیے نا اہل ہے۔" انھوں نے یہ بھی کہا کہ "یہ تخلیقی زبان ہو سکتی ہے جو ادب اور شاعری کی تخلیق کے لیے بہتر ہو، لیکن سرکاری کام کاج اس میں کیا جانا ناممکن ہے کیونکہ اس کے پاس اس کے لیے الفاظ کا ذخیرہ نہیں ہے۔" اس کے ساتھ ہی انھوں نے یہ بھی کہا کہ "اردو کوئی علاحدہ زبان نہیں ہے بلکہ ہندی ہی کی ایک شیلی ہے جس میں عربی اور فارسی کے الفاظ کی بھرمار ہے۔" نتیجتاً یو پی میں 1951 میں پاس کیے گئے سرکاری زبان قانون کے تحت ہندی کو سرکاری زبان قرار دے دیا گیا اور اردو کے لیے کوئی جگہ نہیں چھوڑی گئی۔ تعلیم کے سلسلے میں یو پی بورڈ نے اعلان کر دیا کہ اب ہندی ہی اسکولوں میں ذریعۂ تعلیم ہوگی اور ہائی اسکول کے امتحان کے لیے یہی واحد زبان ہوگی۔ اس کے ساتھ ہی سرکار نے اردو میڈیم اسکولوں کو دی جانے والی امدادی رقم بھی بند کر دی۔ اگر چہ نہرو نے بار بار یہ کہا کہ اگر اردو کو یو پی کی دوسری سرکاری زبان مان لیا جائے تو اس سے ہندی کی اہمیت کم نہیں ہوگی، لیکن یو پی کے سیاست دانوں نے اس بات کو نہیں مانا۔ انگریزوں کے زمانے میں جو اختلافات پیدا ہوئے تھے وہ نہ صرف کھل کر سامنے آگئے بلکہ اور زیادہ مضبوط ہو گئے جس کی خاص وجہ ملک کی تقسیم تھی اور شمالی ہند میں اردو صرف مسلمانوں یا نئے ملک پاکستان کی زبان قرار دے دی گئی اور ایک طرح سے اردو ہندستانی تاریخ کے جبر کا شکار ہو گئی۔

آزادی کے فوراً بعد کا عہد اور یو پی میں پایا جانے والا سیاسی ماحول اردو کے فروغ میں معاون نہیں ہوا بلکہ زبردست رکاوٹ بنا۔ اس کے نتیجے میں حکومت کی سہ لسانی پالیسی اور خصوصاً اردو کا سوال سیاست کی نذر ہو گیا۔ مختلف جگہوں سے یہ آواز اٹھنے لگی کہ اردو کو بھی صوبے کی دوسری سرکاری زبان بنایا جائے لیکن اس کی مخالفت میں ایک طرف ہندو فرقہ وارانہ طاقتوں نے اور دوسری طرف کمزور سیکولر طاقتوں کی موقع پرستی نے ایسا ماحول تیار کر دیا جس سے اردو کا زوال شروع ہو گیا۔ یو پی میں تو کانگریس پارٹی نے، جو خود کو ہمیشہ سیکولر کہتی رہی، اردو کو دوسری سرکاری زبان کی شکل میں فروغ دینے کے لیے کچھ بھی نہیں کیا۔ سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ یو پی کا، جس کا زیادہ تر حصہ گنگا کے میدانی علاقوں پر مشتمل ہے، دوسرے صوبوں کے مقابلے میں اپنا کوئی ایسا علاقائی تشخص نہیں جس میں کوئی ثقافتی شناخت پائی جا سکے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ تشخص عام طور پر زبان اور مذہب کی شکل میں ظاہر ہوا اور اردو کو مسلمانوں کی زبان کہا جانے لگا۔ اس کے برخلاف جنوبی ہند کے صوبے مثلاً آندھرا پردیش اور تمل ناڈو میں انگریزوں کے عہد میں ہی بہت مضبوط لسانی تحریکیں چلیں اور انھی کی بدولت ہندستان میں لسانی شناخت کے اعتبار سے صوبوں کا وجود عمل میں آیا اور یہ زبانیں انتظامیہ اور تعلیم کی زبانیں قرار دی گئیں۔ ان صوبوں کی سیاسی پارٹیاں خصوصاً ڈی ایم کے (DMK) اور ٹی ڈی پی (TDP) نے تعلیم اور انتظامیہ کے لیے مادری زبان کے استعمال کے لیے زبردست آوازیں اٹھائیں۔ اگر چہ ملک گیر پیمانے پر یو پی کے بہت سے کانگریسی لیڈروں نے ان لوگوں کی حمایت نہیں کی لیکن جو اردو کے مخالف تھے، وہ در پردہ ان کی حمایت کرتے تھے۔ نہ صرف کانگریس بلکہ دوسری سیاسی پارٹیاں جن سنگھ، سوشلسٹ اور سی پی آئی (CPI) سبھی اس زبان کی مخالفت کر رہے تھے اور وہ اسے غیر ملک کی زبان کہہ رہے تھے۔ کملاپتی ترپاٹھی، آچاریہ نریندر دیو اور حزب مخالف کے بہت سے مشہور رہنما ہندی کے فروغ اور تشہیر کرنے کی انجمنوں سے وابستہ تھے۔ پارٹی کے نظریات چاہے ان کے ایک دوسرے سے مختلف ہوں لیکن اس بات میں ان کا اتفاق شروع سے اب تک قائم ہے۔ وہ سب کے سب ہندی کے حامی رہے ہیں اور سبھی سیاسی پارٹیوں نے آزادی کے بعد یو پی میں اردو سے کنارہ کشی اختیار کر لی ہے۔

مرکزی حکومت نے بھی آزادی کے بعد کے دنوں میں اردو سے اپنی ہمدردی جتانے کے باوجود اس زبان کے فروغ کے لیے کچھ بھی نہیں کیا۔ اندرا گاندھی نے 1972 میں اندر کمار گجرال کی صدارت میں ایک کمیٹی ضرور بنائی جس کا کام اردو کو بڑھاوا دینے کے لیے اپنی سفارشیں پیش کرنا تھا۔ اس کمیٹی نے اپنی رپورٹ 1975 میں پیش کی۔ یہ رپورٹ 250 صفحات میں پھیلی ہوئی تھی اور اس میں 187 سفارشات کی گئی تھیں۔ رپورٹ پارلیمنٹ میں پیش ضرور کی گئی لیکن چونکہ اس کمیٹی کو قائم کرنے میں سیاسی مفاد کو مدِ نظر رکھا گیا تھا اس لیے اس کی سفارشات پر کوئی عمل نہیں کیا گیا۔ چونکہ شمالی ہند کے مختلف صوبوں کے سیاسی رہنماؤں کی اردو کے فروغ میں کوئی دلچسپی نہیں تھی اور وہ اردو کو فروغ دینے کے لیے اٹھائے گئے ہر قدم کی مخالفت کر رہے تھے۔ جنتا پارٹی نے اس رپورٹ کو جاری تو کر دیا لیکن اس پر عمل نہیں کیا اور 1980 کے بعد سے اندرا گاندھی کی بھی اس معاملے میں دلچسپی ختم ہو گئی۔ یو پی میں 1980 میں وی. پی سنگھ نے بحیثیت وزیرِ اعلا کچھ اقدام کیے اور انھوں نے اردو کو دوسری سرکاری زبان بنانے کے سلسلے میں 1982 میں ایک آرڈی ننس بھی جاری کیا لیکن اپنی کاوشوں میں انھیں کوئی کامیابی نہیں ملی۔ بعد میں گجرال کمیٹی کی سفارشات کو لے کر 1979 میں اور 1990 میں آل احمد سرور اور علی سردار جعفری کی نگرانی میں دو اور کمیٹیاں بنیں، انھوں نے بھی اپنی رپورٹیں سرکار کو پیش کر دیں لیکن ان پر بھی کوئی عمل درآمد نہیں ہوا۔ سردار جعفری کمیٹی نے تو اپنی رپورٹ میں اس بات کا خاص طور سے تذکرہ کیا کہ گجرال کمیٹی کی کسی بھی سفارش پر کسی بھی طرح کا عمل درآمد نہیں کیا گیا ہے۔

6/اکتوبر 1989 کو اتر پردیش اسمبلی نے یو پی سرکاری زبان قانون میں ترمیم کر کے اس میں سیکشن 3 کا اضافہ کیا جس کے تحت اردو کو صوبے کی دوسری سرکاری زبان تسلیم کیا گیا۔ یہ قدم این ڈی تیواری نے 1989 کے لوک سبھا

انتخابات سے پہلے اٹھایا تھا تاکہ اس کے ذریعے اقلیت کا ووٹ حاصل کیا جاسکے۔ البتہ اس پر عمل درآمد 1994 میں ملائم سنگھ یادو نے کیا۔ یہ قانون جو آئین کی دفعہ 345 کے تحت پاس کیا گیا تھا، اس کے خلاف یوپی ہندی ساہتیہ سمیلن نے 1989 میں الہ آباد ہائی کورٹ میں رٹ پٹیشن داخل کردی۔ اس پٹیشن میں کہا گیا تھا کہ: ''جب ایک بار ہندی کو سرکاری زبان تسلیم کرلیا گیا ہے تو اب اسمبلی کو کوئی اختیار نہیں ہے کہ وہ سرکاری کام کاج کے لیے کسی دوسری زبان کو تسلیم کرے۔'' اس کے علاوہ اس کا یہ بھی کہنا تھا کہ لسانی پالیسی میں ایک شق یہ بھی ہے کہ کسی زبان کو ماننے والوں کی ایک بڑی تعداد اس کی مانگ کرے تبھی اسے سرکاری زبان بنایا جاسکتا ہے اور تیسری بات یہ ہے کہ یوپی کی آبادی کا بہت کم حصہ اردو زبان بولتا ہے۔ اگر چہ ہائی کورٹ نے اس پٹیشن کو ماننے سے انکار کردیا اور اس کے خلاف اپنا فیصلہ صادر کردیا کہ اسمبلی کو کسی بھی زبان کو سرکاری زبان کی حیثیت سے ماننے کا اختیار ہے تاہم یوپی ہندی ساہتیہ سمیلن نے سپریم کورٹ میں اس کے خلاف ایک دوسری پٹیشن داخل کردی جو ابھی سپریم کورٹ کے زیر غور ہے۔ کیونکہ عدالتی کارروائی کے دوران اس میں کافی لمبا عرصہ گزر گیا اور ہندی ساہتیہ سمیلن نے حکومت کے آرڈی ننس کے خلاف اسٹے آرڈر حاصل کرلیا تھا، اس لیے حکومت نے بھی اس معاملے میں کوئی دلچسپی نہیں لی۔ اس طرح سے یوپی میں پہلی بار حکومت نے جو ذرا سی دلچسپی اردو کے معاملے میں دکھائی تھی وہ بھی اس تنازعے میں پھنس کر ختم ہوگئی۔

یوپی حکومت کی اس پالیسی کی وجہ سے پورے صوبے کے تعلیمی اداروں کے نصاب سے اردو غائب ہوگئی۔ وہ سہ لسانی پالیسی جسے سبھی صوبائی حکومتوں نے منظور کرلیا تھا، یوپی میں اس پالیسی کے تحت اردو کی جگہ پر سنسکرت جدید ہندستانی زبان کی حیثیت سے پڑھائی جارہی ہے۔ سہ لسانی پالیسی کے تحت اس بات کا امکان تھا کہ جدید ہندستانی زبان کی حیثیت سے اردو نصاب میں داخل ہوجائے گی لیکن ایسا نہیں ہوا۔ آزادی سے پہلے ہر تعلیمی ادارے میں اردو پڑھائی جاتی تھی لیکن سہ لسانی فارمولے کے تحت یہ سلسلہ بالکل ختم ہوگیا۔ آج یوپی میں اردو میڈیم کا کوئی ایک بھی پرائمری یا جونیر ہائی اسکول نہیں ہے۔ صرف دو اردو میڈیم اسکول ہیں جو علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے تحت چلتے ہیں۔ اسی طرح اس زبان کی اب نہ تو کوئی نصابی کتابیں ہیں اور نہ ہی پورے صوبے میں اردو پڑھانے والا کوئی مدرس۔ اور جو دو اردو میڈیم اسکول ہیں وہاں بھی سائنس کی تعلیم انگریزی میں دی جاتی ہے۔ کچھ اسکولوں میں خصوصاً جو اقلیتوں کے تعلیمی ادارے ہیں، اردو کو اختیاری مضمون کے طور پر لینے کی سہولت موجود ہے اور اس اختیاری مضمون کا امتحان بھی ہائی اسکول میں اردو میں لیا جاتا ہے لیکن سہ لسانی فارمولے کے تحت یوپی میں کچھ ایسا انتظام کیا گیا ہے کہ زیادہ تر لڑکے انگریزی کو ہی فوقیت دیتے ہیں۔ اس کے برخلاف مہاراشٹر جہاں صرف 43 لاکھ اردو بولنے والے ہیں اور کرناٹک جہاں اردو بولنے والی آبادی 35 لاکھ ہے، ان دونوں صوبوں میں بالترتیب 2104 اور 2853 اردو میڈیم اسکول ہیں۔ یوپی میں اس تعصب کی پالیسی کی وجہ سے جو والدین اپنے بچوں کو اردو پڑھانا چاہتے ہیں وہ انھیں مدرسوں میں بھیجنے کے لیے مجبور ہیں، جو اب اردو تعلیم کا واحد ذریعہ رہ گیا ہے۔ ان مدرسوں میں بھی اردو تعلیم پر اتنا زور نہیں ہوتا جتنا کہ مذہبی تعلیم پر۔ مدرسوں میں پائی جانے والی اردو کا کوئی تعلق بولی جانے والی اردو سے نہیں ہوتا۔ اس لیے اردو کا مزید زوال ہورہا ہے۔ چونکہ یوپی میں کسی بھی سطح پر اردو کی تعلیم کا کوئی انتظام نہیں ہے اس لیے آزادی کے بعد کی مسلمانوں کی نسل اردو زبان سے اب نابلد ہوتی چلی جارہی ہے۔

یوپی حکومت کی اس غیر دلچسپی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اب نہ صرف سبھی سیاسی پارٹیوں نے اپنا دامن اس سے جھاڑ لیا ہے بلکہ آزادی کے بعد پیدا ہونے والی نسل میں بھی اب اردو بولنے والے لوگ نہیں رہ گئے ہیں۔ کسی بھی کثیر لسانی ملک میں جب تک زبان کو سیاسی پارٹیوں اور عوام کا تعاون حاصل نہ ہو، وہ زبان مرجاتی ہے۔ کچھ ایسا ہی اردو کے ساتھ بھی ہوا۔ یوپی میں مسلمانوں کا مڈل کلاس طبقہ اپنے بچوں کو اردو نہیں پڑھاتا۔ پبلک اسکولوں میں داخل کرتا ہے اور ان اسکولوں میں اردو پڑھانے کا کوئی انتظام نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ بازار کی ضرورتیں بھی زبان کی ترقی کا باعث ہوتی ہیں۔ چونکہ اردو کو بازار سے کوئی تعاون نہیں مل رہا ہے اس لیے جو لوگ اردو پڑھنا چاہیں بھی تو انھیں روزگار کی سہولت حاصل نہیں ہوتی۔ مدرسوں میں پڑھنے والے بچے عام طور پر غریب گھرانے کے ہوتے ہیں جو پبلک اسکول میں نہیں جاسکتے۔ حالت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ غریب طبقے کے جو لوگ اپنے بچوں کو پبلک اسکول میں بھیج سکتے ہیں وہ اپنا خرچ کاٹ کر انھیں پبلک اسکولوں میں ہی بھیجتے ہیں۔ یوپی میں جو لوگ اردو زبان سے اب بھی دلچسپی رکھتے ہیں یا زبان کے نام پر سیاست بلکہ تجارت کررہے ہیں، وہ بھی اپنے بچوں کو اردو زبان گھروں میں بھی نہیں پڑھاتے۔ نتیجتاً اب یہ صرف گھروں میں بولی جانے والی زبان تک ہی محدود ہوکر رہ گئی ہے۔ کچھ یہی حال اردو صحافت کا بھی رہا ہے۔ اس نے بھی زبان کے فروغ اور ترقی کے لیے کچھ بھی نہیں کیا۔ ان کی ساری دلچسپی سرکاری اشتہار حاصل کرنے تک ہی محدود رہتی ہے۔ اب زبان کی ترقی اور زندگی کا سارا دارومدار اس بات پر ہے کہ لوگ انفرادی طور پر یا انجمنیں بنا کر صدق دل اور خلوص سے اسے بچانے اور زندہ رکھنے کی کوشش کریں۔

(بشکریہ Economic & Political Weekly، ممبئی، 6 جولائی 2002)

□□□

Centre for Political Studies,
School of Social Sciences,
JNU, New Delhi-67

ارجمند آرا

اردو کے حوالے سے چند معروضات

اس بات سے شاید ہی کسی کو اختلاف ہو کہ انسان جس تہذیبی ماحول میں آنکھ کھولتا ہے وہ تہذیب اور اس کے تمام مظاہر جن میں قومیت، مذہب اور زبان وغیرہ سب شامل ہیں، شعوری یا لاشعوری طور پر اس کی شخصیت کا لازمی حصہ بن جاتے ہیں۔ لیکن ان مظاہر کے ساتھ اپنی جذباتی وابستگی وہ اسی وقت محسوس کر پاتا ہے جب وہ ان کے لیے کسی قسم کے عدم تحفظ یا اندیشے سے دوچار ہوتا ہے۔ آزادی کے بعد سے آج تک اردو داں لوگ بھی اسی قسم کے اندیشوں میں مبتلا رہے ہیں۔ اردو کی صورت حال پر اگر ہم کئی دہائیوں پرانا کوئی مضمون پڑھیں تو یہ دیکھ کر ہمیں مطلق حیرت زدہ نہیں ہونا چاہیے کہ اتنے برس پہلے بھی ایک ہی رونا تھا کہ اردو ختم ہو رہی ہے اور آج بھی یہی نالہ ہر طرف سنائی دیتا ہے۔

ہندستان میں تاریخ کے جبر اور سیاسی و سماجی حالات کے سبب اردو جس طرح کے حالات سے دوچار ہوئی، ان میں اردو والوں کے خدشات غلط تو نہیں کہے جاسکتے لیکن یہ بھی درست ہے کہ اپنی جذباتی وابستگی کے سبب انھوں نے خطرات کو کچھ زیادہ ہی شدت سے محسوس کیا اور اردو کو ایسی کمزور زبان سمجھا گویا وہ چشم زدن میں صفحۂ ہستی سے مٹ جائے گی۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ اس قسم کے نعروں کے باوجود اردو داں آبادی اور ان کی لیڈرشپ نے اردو کے تحفظ کے لیے کسی ایسے ایک نکاتی پروگرام پر عمل نہیں کیا جس کے تحت اردو کو سیکولر نصاب کا حصہ بنایا جاسکے۔ آج بھی اردو کے احیا کا اسمِ اعظم صرف اور صرف اسکول کے نظام میں اردو کی شمولیت میں مضمر ہے اور یہ کام اردو عوام کی کوششوں کے بغیر ممکن نہیں۔

اس کے باوجود یہ ایک حقیقت ہے کہ اردو کی مقبولیت میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے اور بول چال کی حد تک اس کے الفاظ خاص و عام کے دلوں میں جگہ پا رہے ہیں۔ غزل گائیکی نے خصوصاً اس کی مقبولیت میں بے پناہ اضافہ کیا ہے۔ آج یہ بات موجب تسکین ہے کہ اردو کی طاقت نے بہت سے اندیشوں کو باطل ثابت کردیا ہے۔

لیکن ایک پہلو ایسا بھی ہے جسے اردو کے فروغ میں سازگار نہیں کہا جاسکتا۔ وہ یہ ہے کہ آج اردو مسلمانوں، مدرسوں، مذہب اور ادب تک محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ اردو وہ واحد زبان ہے جو ہندستان کی مشترکہ تہذیب کی پروردہ ہے، اس کی آبیاری میں ہر مذہب اور ہر فرقے کے لوگوں کا خونِ جگر شامل ہے۔ یہ بات بھی درست ہے کہ 1857 کی پہلی جدوجہدِ آزادی سے لے کر حصول آزادی تک، یعنی پوری ایک صدی تک شمالی ہند میں اردو واحد زبان تھی جس کی صحافت نے بڑا مجاہدانہ کردار ادا کیا اور تاریخ میں اپنا نام سنہری حروف میں درج کرایا۔ حریت اور آزادی کا پیغام عوام تک پہنچانے والے ان اردو اخبارات و رسائل کو شائع کرنے والوں اور ان میں مضامین لکھنے والوں میں بھی ہر مذہب اور ہر فرقے کے لوگ شامل تھے۔ لیکن یہ اردو کا ماضی ہے؛ آج کی حقیقت یہی ہے کہ اس کو مسلمانوں کی تہذیبی میراث سمجھا جاتا ہے اور بیشتر غیر مسلم حضرات اردو کا استعمال مسلم کلچر کی نمائندہ زبان کے طور پر کرتے ہیں۔ ان کے لیے اردو کا مطلب محفلوں میں اردو کے چند شائستہ جملے بولنے اور غزلیں سننے تک محدود ہے۔ ضمناً عرض ہے کہ حال ہی میں مجھے ایک گھریلو تقریب میں شرکت کا اتفاق ہوا جہاں صاحب خانہ نے میرا تعارف اپنی اردو ٹیچر کے طور پر کرایا۔ یہ صاحب جن کے گھر تقریب تھی غیر مسلم ہیں اور دلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے اردو میں ایڈوانس ڈپلوما کر رہے ہیں۔ ان کی ایک مہمان کا ردعمل تھا، ''اچھا انکل آپ اردو پڑھ رہے ہیں، تو اسلام کب قبول کر رہے ہیں؟'' ردعمل ظاہر کرنے والی یہ لڑکی دلی کے ایک پبلک اسکول کی نویں جماعت کی طالبہ تھی اور اس نے اپنے ردعمل کا اظہار بھی اردو ہی میں کیا تھا۔ لیکن اس کے ذہن میں بھی یہی بات تھی کہ اردو پڑھنے کا مطلب ہے اسلام قبول کرلینا۔

دوسری طرف یہ بھی ایک بہت بڑی سچائی ہے کہ اسکولوں کے تعلیمی نظام سے اردو کے اخراج کے سبب اردو کی تعلیم بری طرح متاثر ہوئی ہے۔ آزادی کے بعد شمالی ہند میں اردو والوں کی کئی نسلیں اردو سے بے بہرہ گزر گئی ہیں۔ نتیجتاً اردو داں طبقے کے لوگوں کے ان بچوں جو صرف اسکول کے نظام کے ذریعے تعلیم حاصل کرتے ہیں کی اکثریت اب اردو رسمِ خط سے واقف نہیں ہے، اور اپنے ادب سے بھی ان کی واقفیت بس واجبی سی ہے، اور وہ بھی ممبئی کی فلموں اور غزل گائیکوں کے ذریعے۔ شمالی ہند کے مسلمانوں کا وہ محدود مخصوص طبقہ ہی اب اردو سے وابستہ رہ گیا ہے جو بالخصوص غربت کے سبب یا پھر مذہبی وجوہ سے اپنے بچوں کو مدرسوں میں داخل کراتا ہے۔ یا پھر وہ اکا دکا لوگ اردو پڑھتے ہیں جو اردو ادب کی اعلا تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں یا کرتے ہیں۔ انھی دو قسم کے بیک گراؤنڈ سے آنے والے لوگ اردو اخبار و رسائل کے لیے لکھنے کا کام بھی کرتے ہیں۔

یہ صورت حال بڑی افسوس ناک ہے کیوں کہ اس کے سبب ایک تو اردو صرف مسلمانوں تک سمٹ کر رہ گئی ہے، دوسری خرابی یہ پھیلی ہے کہ صرف مذہب

اور ادب تک محدود ہو جانے کے سبب اردو حلقوں سے دانش وری کی روایت معدوم ہوتی جا رہی ہے۔ سائنسی اور علمی مضامین عنقا ہو رہے ہیں اور علم اور دانش وری کی روایت میں عدم تسلسل کے سبب اردو کی ادبی تحریریں بھی اب معیار سے گرتی جا رہی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر اردو کا معاصر ادب بھی زوال آمادہ ہو گیا تو یہ زبان صرف مذہبی ضروریات تک محدود ہو جائے گی اور اس کے عظیم سرمایۂ ادب کا مطالعہ ہم ماضی کی دیگر عظیم زبانوں (مثلاً سنسکرت) کے عظیم ادب کی طرح کریں گے یا اسے ریسرچ کا موضوع بنائیں گے۔ بول چال کی زبان کے طور پر تو اردو زندہ رہے گی، اس کا اسکرپٹ بھی مسلمان بچالے جائیں گے لیکن زندگی کی زبان یعنی فنکشنل لینگویج (Functional Language) کے طور پر اور ادبی اظہار کی زبان کے طور پر یہ کہاں پہنچے گی، اس کا اندازہ بآسانی لگایا جا سکتا ہے۔

ایسے تاریک مستقبل سے نجات حاصل کرنے کے لیے لازم ہے کہ یہ زبان روزمرّہ کی اور تعلیمی ضرورتوں سے جڑے، اردو سے جذباتی وابستگی محسوس کرنے والے ہمارے تعلیم یافتہ لوگ لازمی طور پر اردو سیکھیں اور اردو میں لکھیں اور پڑھیں۔ دوسری طرف مدرسوں اور اردو ذریعۂ تعلیم سے آنے والے طالب علموں کے لیے انسانی اور سماجی علوم اور سائنس کی کتابیں اردو میں مہیا ہوں تا کہ جدید تعلیم کی سوغاتوں سے وہ بھی بہرہ ور ہو سکیں اور ان میں ویسے بھی علم و دانش کی روایت جڑ پکڑے۔

اردو کے فروغ میں یہی شاید سب سے اہم نکتہ ہے اور اردو کی ترویج کے لیے کوشاں افراد، اداروں اور انجمنوں کو چاہیے کہ وہ ان خطوط پر توجہ مرکوز کرتے ہوئے اپنی حکمت عملی ترتیب دیں۔ ماضی میں جب بھی اردو تعلیم کو مین اسٹریم ایجوکیشن میں شامل کرنے کی بات اردو والوں نے کی ہے تو اس کے پس منظر میں یہی محرکات کارفرما رہے ہیں۔ اردو کی ترویج کے مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے اردو کے رضاکار اداروں نے مقدور بھر کوشش کی ہے۔ ان کوششوں میں اردو کو کمپیوٹر اور میڈیا سے جوڑنے کی کوششیں بھی شامل ہیں اور عصری علوم کو اردو میں منتقل کرنے کی مساعی بھی۔ لیکن اردو کے رضاکار اداروں کے وسائل چونکہ بہت محدود ہیں اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو کی انجمنیں اور باوسائل ادارے آگے آئیں اور اردو کے استحکام اور اس کا جائز مقام دلانے کے لیے ایسی تمام دوسری زبانوں کی مدد بھی لیں جو اردو کی طرح خطرات سے دوچار ہیں۔

Department of Urdu
Faculty of Arts,
Delhi University,
Delhi-110007

□□□

اہلِ اردو کے دیرینہ خوابوں کی تعبیر

اردو انسائیکلوپیڈیا

جو بین الاقوامی معیار کو سامنے رکھ کر مرتب کیا گیا ہے

32 علوم پر مشتمل تین کلیدی جلدیں شائع ہو گئیں

قومی کونسل برائے فروغِ اُردو زبان نے اردو میں پہلا مکمل اور بین الاقوامی معیار کا انسائیکلوپیڈیا شائع کیا ہے۔ ابتدائی تین جلدیں 32 علوم پر مشتمل ہیں۔ جملہ علوم پر مختصر نوشتے آٹھ جلدوں میں شائع کیے جائیں گے۔

سارا مواد بڑی دیدہ ریزی اور مشقت کے ساتھ سلیس زبان اور دلنشیں پیرایے میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ ایسی کاوش ہے جو آئندہ کئی نسلوں کو علم و دانش سے مالا مال کرتی رہے گی۔ ادیبوں، صحافیوں، طلبہ اور علم دوست قارئین کے لیے ایک نادر تحفہ، ہر جلد اپنے آپ میں مکمل ہے۔

جلد اوّل، 578 صفحات، قیمت -/300 روپے۔ جلد دوم، 568 صفحات، قیمت -/450 روپے۔ جلد سوم، 614 صفحات، قیمت -/450 روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

اپیل

اردو کو قومی تعلیم میں اس کا جائز مقام دلانے کی مہم

آزادی کے بعد سے اب تک اردو تعلیم کے سوال پر اردو داں آبادی کے ذہن میں مسلسل خلفشار رہا اور یہ اہم مسئلہ فروعی اور سیاسی بحثوں میں الجھ کر رہ گیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اردو داں بچے اپنی مادری زبان سیکھنے اور پڑھنے سے محروم ہو گئے۔ نہ ان کے علاقوں میں اسکول کھولے گئے، نہ پرائمری سطح پر انھیں اپنی تعلیم اپنی مادری زبان کے ذریعے حاصل کرنے کا موقع ملا اور نہ ثانوی سطح پر ایک اختیاری مضمون کی حیثیت سے ہی اردو پڑھنے کے مواقع نصیب ہو سکے جب کہ قانوناً یہ ان کا حق تھا کہ سہ لسانی فارمولے کے تحت وہ زبانِ اول کی حیثیت سے اردو پڑھیں۔ چوں کہ اردو آبادی میں اکثریت مسلمانوں کی تھی اس لیے اردو کو یا تو دینی مدارس میں پناہ ملی یا پھر گھر پر یا شبینہ مدارس وغیرہ میں اردو مادری زبان والے بچوں نے جز وقتی تعلیم کے ذریعے اردو سے تھوڑی بہت واقفیت حاصل کر لی۔ زبان کا تعلق اگلی نسل سے قائم نہ ہونے کی وجہ سے اردو کا میدان سکڑتا گیا اور آج ہمارے بچے اردو بول لیتے ہیں، غلط تلفظ ہی سے سہی، مگر اس عظیم زبان کو نہ لکھ سکتے ہیں نہ پڑھ سکتے ہیں۔

8تا11/ فروری 2002 کو ڈاکٹر ذاکر حسین اسٹڈی سرکل نے اردو تعلیم سے متعلق تمام پیچیدہ سوالوں کا جواب تلاش کرنے اور ان کے حل کے لیے رائے عامہ ہموار کرنے کی غرض سے ایک چار روزہ بین الاقوامی کانفرنس منعقد کی تھی جس میں ہندستان اور بیرونی ممالک کے ماہرینِ تعلیم نے بحث و تمحیص کے بعد کچھ نتائج اخذ کیے۔ ان کی بنیاد پر اردو تعلیم کے احیا کی حکمت عملی تیار کی گئی جس کے بنیادی نکات درج ذیل ہیں:

1۔ چونکہ آئین ہند میں شامل تمام زبانیں بشمول ہندی اُن ریاستوں سے باہر جن میں وہ اکثریت کی زبانیں ہیں، اقلیتی زبانوں کا درجہ رکھتی ہیں اور عملی طور پر سبھی ریاستوں اور ضلعوں میں متعدد زبانیں بولی جاتی ہیں اس لیے سماجی تحرک کو بڑھاوا دینے کی غرض سے مختلف سطحوں پر لسانی اقلیتوں کے بارے میں آئین کی روح کے مطابق ایک یکساں قومی پالیسی وضع کرنے کی ضرورت ہے۔

2۔ اردو کی منفرد حیثیت اس لیے ہے کہ وہ اگر چہ پورے ملک میں بولی جاتی ہے لیکن کسی بھی ریاست میں اکثریت کی زبان نہیں ہے اس لیے اردو کے فروغ کے لیے قومی اور ریاستی سطح پر خصوصی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ اردو کو بھی بالعموم وہی مسائل درپیش ہیں جن سے ہر ریاست کی اقلیتی زبانیں دوچار ہیں۔ ہندستان گیر سطح پر اردو کے مسائل اُسی صورت میں حل ہو سکتے ہیں جب آئین کے آٹھویں جدول میں شامل تمام زبانوں کے لیے یکساں قومی تعلیمی پالیسی اختیار کی جائے۔ اس سے لسانی اقلیتوں کے لیے ایک قومی ضابطہ ترتیب دینے میں بھی مدد ملے گی۔

3۔ اس سلسلے میں دوسری زبانوں کو بھی جو ہندی اکثریت والے علاقے میں کروڑوں لوگوں کی مادری زبانیں ہیں اور جو اپنی شناخت کے لیے جدوجہد کر رہی ہیں اور جن کو اب تک دانستہ طور پر نظر انداز کیا گیا ہے، تعلیمی نظام میں مناسب جگہ دینے کے لیے آئین کے آٹھویں جدول میں شامل کرنے کی ضرورت ہے۔

4۔ قومی سطح پر اردو سے متعلق پالیسیوں کے نفاذ اور اردو تعلیم کی صورت حال کے ساتھ ابتدائی سے ثانوی تعلیم تک دستیاب تعلیمی سہولیات کے جائزے اور ان کے فروغ کے لیے مناسب قدم اٹھانے کی ضرورت ہے تاکہ اردو سیکولر تعلیم کے نصاب میں اپنا مناسب مقام حاصل کر سکے۔

5۔ کسی علاقے اور گروہ کی تعلیمی پسماندگی اس گروہ کو صف بہ صف جدید تعلیم سے مزین کر کے ہی دور کی جا سکتی ہے اور آئینِ ہند کے مطابق یہ ریاست کی ذمے داری ہے کہ وہ اپنے تمام شہریوں کی تعلیم کے لیے ہر ممکن اقدام کرے۔ ریاستی حکومتوں کو چاہیے کہ وہ ریاست میں رائج تمام زبانوں کو تعلیمی نظام میں مناسب مقام اور سہولیات فراہم کرائیں۔

6۔ بالخصوص ان علاقوں میں جن کی آبادی کے معتدبہ حصے کی مادری زبان اردو ہے وہاں ابتدائی سطح کے سرکاری اور سرکاری امداد سے چلنے والے، تعلیمی بورڈوں سے ملحقہ، اسکولوں کے نصاب میں اردو کو ذریعۂ تعلیم کا درجہ ملنا چاہیے۔

قومی ضابطے کے مطابق ہر تین سو نفوس پر مشتمل آبادی کے لیے ایک ابتدائی تعلیم کا اسکول ہونا چاہیے۔ اردو داں آبادی کے علاقوں میں خواہ وہ دیہات ہوں یا شہر، بنیادی تعلیم کے ہمہ گیر فروغ کے لیے قومی پیمانے پر اردو

● [یہ اپیل ڈاکٹر ذاکر حسین اسٹڈی سرکل، نئی دہلی نے جاری کی تھی جو انگریزی کے معروف ہفت روزہ "مین اسٹریم" کے 29/نومبر 2003 کے شمارے میں شائع ہوئی تھی۔ اس کا ترجمہ سرکل کے سکریٹری ڈاکٹر اطہر فاروقی نے خصوصی طور پر "اردو دنیا" کے لیے کیا ہے۔]

میڈیم ابتدائی اسکول ضرور ہونے چاہئیں۔ یہ مطالبہ آئین کی روح کے عین مطابق ہے۔ اردو اسکولوں کو ایسی جگہ قائم کیا جانا چاہیے جہاں آس پاس کی اردو آبادی کے دیگر تمام بچے تعلیم حاصل کرسکیں۔

ریاست کی علاقائی زبان کو تیسری جماعت سے اردو میڈیم اسکول میں ایک لازمی مضمون کے طور پر شامل نصاب کرنا چاہیے جبکہ اسے ثانوی تعلیم میں چھٹی جماعت سے مشترک ذریعۂ تعلیم ہونا چاہیے۔

اردو پڑھنے والے طلبہ کے لیے چھٹی سے دسویں جماعت تک سہ لسانی فارمولے کے تحت اردو کو پہلی اور لازمی زبان کا درجہ ملنا چاہیے اور اس کے ساتھ ہندی یا ریاست کی علاقائی زبان کو دوسری لازمی زبان کا۔ چھٹی جماعت سے غیر اردو داں طلبہ کے لیے بھی اردو کو دوسری اختیاری زبان کا درجہ ملنا چاہیے۔

غیر ہندی ریاستوں میں اردو داں بچوں کے لیے پہلی زبان کے طور پر اردو ہندی کا ایک متبادل مشترک کورس بھی مرتب کرنا چاہیے۔

تیسری زبان کی حیثیت سے ثانوی درجے کے طلبہ کو انگریزی یا کلاسیکی زبانیں پڑھنے کا اختیار ہونا چاہیے۔

سنسکرت قابل قدر ہے لیکن تعلیمی نظام میں اسے کسی مادری زبان کی جگہ نہیں لینی چاہیے۔

7۔ مذہبی تعلیمی اداروں کو حکومت کی امداد غیر ضروری ہی نہیں، غیر آئینی بھی ہے۔ جہاں تک مسلم طلبہ کا سوال ہے، دینی مدارس ان کے محدود دینی مقاصد کی تکمیل کرتے ہیں۔ دینی مدارس و مکاتب مسلم بچوں کو اسلام کی بنیادی تعلیم دیتے ہیں اور مذہبی فرائض کی ادائیگی سے واقف کراتے ہیں۔ بڑے دینی مدارس جو عالم پیدا کرتے ہیں، وہ مذہبی تعلیم کی بقا و فروغ کے لیے پورے تقدس اور انہماک سے کام کر رہے ہیں۔ ان کے نظم و ضبط کی ذمے داری مسلمانوں پر چھوڑ دینی چاہیے۔ حالانکہ مذہبی تعلیم کے بقا اور فروغ میں دینی مدارس کا بہت اہم رول رہا ہے مگر سیکولر تعلیم کی ذمے داری یہ مدارس ادا نہیں کر سکتے اور نہ ہی ان سے یہ توقع کرنی چاہیے۔

8۔ بنیادی تعلیم کے لیے طلبہ کی عمر کی حد چودہ سال سے بڑھا کر پندرہ سال کر دینی چاہیے جو کہ ثانوی امتحانات میں شریک ہونے کی (کم سے کم) لازمی عمر ہے۔

آئین کی حالیہ 86 ویں ترمیم میں تعلیم کو ہر شہری کا بنیادی حق قرار دیا گیا ہے۔ اس قانون میں مزید تبدیلی کرنے کی ضرورت ہے۔ مثلاً ابتدائی تعلیم کا ذریعہ مادری زبان ہو اور تعلیمی یکسانیت اور ضرورت کے حساب سے قومی معیار کے پرائمری اور سیکنڈری اسکولوں کے قیام اور اسکولوں کی تعداد اور جگہ کے تعین کو شامل کرنا چاہیے۔

آئین ہند کی دفعہ 350-A کے تحت مادری زبان کو لازمی ذریعۂ تعلیم قرار دیا جانا چاہیے۔ دفعہ 347 میں Substantial Proportion (معقول آبادی) کی اصطلاح کو واضح کرتے ہوئے یہ بتایا جانا چاہیے کہ Substantial کا مطلب ''برائے نام'' نہیں ہے اور بہرصورت کسی بھی علاقے کی کم سے کم 5% لوگوں کی مادری زبان کو تمام انتظامی (پنچایت، بلدیاتی اور ضلعی) سطحوں پر مکمل سہولیات فراہم کرنی چاہیے۔

لسانی اقلیتوں کے کمشنر کو ایک آئینی عہدے دار کی حیثیت سے اپنے فرائض کی ادائیگی کے لیے موثر اختیارات حاصل نہیں ہیں۔ بالعموم ریاستی حکومتیں اسے مطلوبہ معلومات تک فراہم کرنے کی زحمت نہیں کرتیں۔ اگرچہ اس کی سالانہ رپورٹ پارلیمنٹ میں پیش کی جاتی ہے لیکن نہ تو اس پر کبھی بحث ہوتی ہے اور نہ ہی اس کی طرف کوئی سنجیدگی سے توجہ دیتا ہے۔ ان رپورٹوں کی ایک بڑی خامی یہ بھی ہے کہ ان میں ریاستوں میں لسانی اقلیتوں سے متعلق اطلاعات نہ تو مکمل ہوتی ہیں اور نہ ہی اپ ٹو ڈیٹ۔ اس لیے اس عہدے کو ختم کر کے اس کی جگہ قومی کمیشن برائے لسانی اقلیت قائم ہونا چاہیے جسے نیم عدالتی اختیارات حاصل ہوں۔

9۔ جمہوریت کی بقا اقلیتوں کی زبانوں اور ان کے کلچر کی بقا میں مضمر ہے۔ اردو صرف ایک اقلیتی زبان ہی نہیں بلکہ ہندستان کی مشترکہ تہذیب کی بے مثال علامت اور سیکولر اقدار کا خزینہ ہے اور اس لیے یہ زبان خصوصی توجہ کی حقدار بھی ہے۔ اس کی جائے پیدائش اور پرورش کے علاقے میں اس کا فروغ ہونا چاہیے نہ کہ اس کا زوال۔ اس لیے ضروری ہے کہ اس کے تحفظ اور احیا کے لیے ایک قومی تحریک شروع کی جائے جس کے لیے مضبوط سیاسی ارادے اور قوت کی سخت ضرورت ہے۔ اس تحریک کو ملک کی ہر ریاست میں وہاں کی لسانی اور تہذیبی اقلیتوں کے تعلیمی اور تہذیبی حقوق کے لیے جدوجہد کرنی چاہیے جس کا مقصد یہ ہو کہ تمام لسانی اقلیتوں کو ہر ریاست میں ہر سطح پر ایک قومی ضابطے کے مطابق یکساں اور موثر حقوق حاصل ہوں۔

ایک میمورنڈم کی شکل میں اردو کے احیا کا یہ نقشہ 8 رفروری 2003 کو صدر جمہوریہ ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ اس وفد میں ہندستان کی تقریباً پچاس مقتدر علمی ہستیاں شامل تھیں۔ صدر محترم نے تقریباً ایک گھنٹہ ان قراردادوں پر گفتگو کی اور ان پر عمل آوری کے لیے انھیں مرکزی اور صوبائی حکومتوں کو بھیجنے کا وعدہ کیا۔

اسی اثنا میں مرکزی حکومت کے ذریعے آئین میں کی گئی 86 ویں ترمیم گزٹ ہو کر قانون بن گئی۔ جس کے تحت اسکول کی تعلیم کو ہر بچے کا بنیادی حق تسلیم کیا گیا اور اس پر عمل درآمد کرنے کے لیے ''سروشکشا ابھیان'' چلایا گیا مگر

دوسال گزرنے کے بعد بھی اردوداں بچوں کی محرومی میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔

ہمارے لیے سوال صرف یہ نہیں ہے کہ ہمارے بچے اسکولوں میں داخلہ لیں بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ تعلیم گاہوں میں انھیں اردو کے ذریعے تعلیم حاصل کرنے اور اردو بہ حیثیت زبانِ اول پڑھنے کا پورا موقع ملے۔

ڈاکٹر ذاکرحسین اسٹڈی سرکل نے محسوس کیا کہ آج بھی مقامی اور ضلعی سطح پر اردو کے جاں نثاروں کی تعداد کم نہیں ہے مگر وہ اپنی سطح پر مقامی مسائل سلجھانے میں لگے ہوئے ہیں اور ان کے سامنے کوئی واضح منزل یا طریق کار نہیں ہے، ان حالات کے پیشِ نظر ڈاکٹر ذاکرحسین اسٹڈی سرکل نے فیصلہ کیا ہے کہ جلد ہی ایک کل ہند کانفرنس منعقد کی جائے جس میں اردو کے لیے کام کرنے والی تمام مقامی، ضلعی تنظیمیں، ادارے، انجمنیں اور سبھی اردو کے خادم اور جاں نثار شریک ہوسکیں اور اپنے مقاصد کے حصول کے لیے ایک نظامِ عمل مرتب کرسکیں جس کا مقصد یہ عہد کرنا ہو کہ ہم نئی نسل کو اردو سے محروم نہیں ہونے دیں گے اور اس کے لیے نیچے سے اوپر تک ایک مربوط عوامی تحریک چلائیں گے جس کے مقاصد آئینِ ہند سے ہم آہنگ ہوں گے۔ یہ مجوزہ کانفرنس دہلی میں ہوگی اور باہر سے آنے والے معزز مندوبین کے قیام کا انتظام کیا جائے گا۔

اس کانفرنس کے انعقاد کے لیے جناب سلمان خورشید، صدر، ڈاکٹر ذاکرحسین اسٹڈی سرکل نے جناب سید شہاب الدین، ڈاکٹر خلیق انجم، جنرل سکریٹری، انجمن ترقی اردو ہند، پروفیسر صدیق الرحمان قدوائی، سکریٹری غالب انسٹی ٹیوٹ سے درخواست کی کہ وہ اس کانفرنس کے انعقاد کے لیے آرگنائزنگ کمیٹی میں شرکت قبول کریں۔ اس درخواست کو ان حضرات نے لبیک کہا اور مع سلمان خورشید پانچ مقتدر اکابرین پر مشتمل یہ کمیٹی اس کانفرنس کا انعقاد کرے گی اور اس کانفرنس کے کنوینر ڈاکٹر اطہر فاروقی ہوں گے۔ یہ کمیٹی ہی تاریخ اور دیگر تفصیلات کا اعلان کرے گی۔

یہ آرگنائزنگ کمیٹی اردو کے لیے کام کرنے والی تمام تنظیموں، اداروں، انجمنوں اور جاں نثاروں سے اس پریس ریلیز کے ذریعے درخواست کرتی ہے کہ وہ جلد از جلد اپنے نام، مکمل پتے، ٹیلی فون / فیکس نمبر اور ممکن ہو تو ای میل پتے کے ساتھ درج ذیل پتے پر مطلع کرنے کی زحمت کریں تاکہ تاریخ طے ہوتے ہی ان کی خدمت میں دعوت نامہ روانہ کیا جاسکے۔

80, Sukhdev Vihar, New Delhi - 110025
farouqui@yahoo.com

(بشکریہ "مین اسٹریم" نئی دہلی، 29 نومبر 2003)

□□□

جراثیم

مصنف: بی. وی. برانشن / مترجم: شریف احمد خاں

جراثیم کرۂ ارض پر پائے جانے والے مختلف النوع جانداروں میں بے حد اہم ہیں۔ یہ مفید بھی ہیں اور مضر بھی۔ زندگی اور موت، صحت اور مرض ہر حالت میں جراثیم ہماری زندگی کا اہم جزو ہیں۔ زیرِ نظر کتاب میں جراثیم سے متعلق تفصیلی معلومات بہم پہنچائی گئی ہیں۔

صفحات: 129، قیمت: -/36 روپے

چٹانیں بولتی ہیں

مصنف: دشتو مترا / مترجم: انوار رضوی

چٹانیں ہماری کائنات کا اہم حصہ ہیں۔ اس کتاب میں زمین کی ابتدا اور ارتقا کے مختلف پہلوؤں سے متعلق بعض ایسے حقائق بیان کیے گئے ہیں جن کا انکشاف چٹانوں کے ذریعے ہوا ہے۔ طالب علموں کی آسانی کے لیے متعدد خاکے اور تصاویر بھی شاملِ کتاب ہیں۔

صفحات: 65، قیمت: -/21 روپے

تیز تر اور دور تر (نقل و حمل کی کہانی)

مصنف: محمد نجابت علی / مترجم: مہ جبیں اختر

نقل و حمل انسان کی بنیادی ضرورت ہے۔ پیٹ بھرنے سے لے کر مختلف افراد سے ملنے اور دیگر ضروریات کے تحت ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا انسان کا شوق بھی ہے اور مجبوری بھی۔ زیرِ نظر کتاب میں ذرائع نقل و حمل کے مسلسل ارتقائی سفر سے واقف کرایا گیا ہے۔

صفحات: 82، قیمت: 28 روپے

جنگلات کی کاشت

مصنف: ایس. کوبداس / مترجم: مسرت جہاں

جنگل ہمارے لیے اتنے ہی ضروری ہیں جتنی ندیاں، پہاڑ اور دیگر قدرتی اشیا۔ یہ نہ صرف ماحولیاتی توازن برقرار رکھنے میں معاون ہیں بلکہ کئی اہم صنعتوں کا دارومدار بھی ان پر ہوتا ہے۔ اس کتاب میں مختلف جنگلی درختوں اور جنگل سے متعلق مختلف پہلوؤں سے واقف کرایا گیا ہے۔

صفحات: 95، قیمت: -/24 روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر. کے. پورم، نئی دہلی

غلام نبی مومن

درسی کتب اور ادبِ اطفال

پرائمری اسکول سے یونیورسٹی کی سطح تک منظور شدہ نصاب کی روشنی میں جو کتابیں تیار کی جاتی ہیں وہ درسی کتب کہلاتی ہیں۔ یہ کتابیں طے شدہ اصول وضوابط اور معیار کے مطابق لکھی جاتی ہیں۔ مخصوص نصابِ تعلیم کے تقاضوں کے حصول کے لیے کسی خاص مضمون کی تعلیم دینا ان کی ترتیب و تدوین کا بنیادی مقصد ہوتا ہے۔ یعنی مضمون کی معیاری معلومات کو متعلمین تک پہنچانا پیشِ نظر ہوتا ہے۔ درسی کتاب کے مشمولات سے رہنمائی ملتی ہے کہ کسی مخصوص جماعت میں استاد کم از کم کتنا پڑھائے اور طلبہ کم از کم کتنا سیکھیں نیز یہ اندازہ بھی ہوتا ہے کہ طلبہ کو اپنے طور پر مزید کون سی معلومات حاصل کرنی ہیں اور ان معلومات کا عملی زندگی میں کس طرح اطلاق کرنا ہے۔ گویا درسی کتاب تدریس کی منصوبہ بندی، کلاس روم کی سرگرمیوں کی انجام دہی اور ہوم ورک کا لائحۂ عمل طے کرنے میں استاد کی رہنمائی کرتی ہے نیز کلاس روم اور گھر پر تحصیلِ علم اور امتحان کی تیاری میں طلبہ کی مدد کرتی ہے۔ درسی کتاب طلبہ کے جذبۂ تجسس کو ابھارنے کے علاوہ انھیں اس قابل بھی بناتی ہے کہ وہ اپنی معلومات پر نظرثانی کرکے انھیں ازسرِنو مرتب کرسکیں۔ دیگر کتابوں اور درسی کتاب میں ایک نمایاں فرق یہ ہے کہ درسی کتاب کے کسی بھی سبق سے سرسری طور پر گزرا نہیں جاسکتا بلکہ اس کے ایک ایک لفظ کو سمجھ کر پڑھنا ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں اس میں مشقی سوالات، مزید مطالعے کے لیے ترغیبی سوالات، سرگرمیاں اور عملی کام بھی شامل ہوتے ہیں۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ درسی کتاب، محض 'پڑھنے' کے لیے نہیں ہوتی بلکہ 'پڑھانے' کے لیے ہوتی ہے یعنی استاد درسی کتاب میں مندرج معلومات کو ہدایت کے مطابق طلبہ میں منتقل کرتا ہے۔

تعلیمی مقاصد کے حصول کے لیے درسی کتابیں یقیناً مفید اور موثر وسیلہ ہیں لیکن وہ چند مخصوص تعلیمی مقاصد کے تحت تیار کی جاتی ہیں نیز ان کے ذریعے فراہم کردہ معلومات کا دائرہ محدود ہوتا ہے جبکہ بچوں میں جستجو کا مادہ انتہائی شدید ہوتا ہے۔ وہ ہر شے کی جزئیات کو جاننے کی خواہش رکھتے ہیں۔ درسی کتاب سے ان کی اس شدید خواہش کی تشفی نہیں ہو پاتی۔ علاوہ ازیں طلبہ اپنی عمر کا بیشتر حصہ اسکول سے باہر گزارتے ہیں۔ اسکول کے باہر بھی ان کی ذہنی تربیت کرنا، انھیں انسان دوست اور اچھا شہری بنانے کی کوشش کرنا ضروری ہے۔ یہ دو خاص وجوہات ہیں جو ادبِ اطفال کی شدید ضرورت کا احساس دلاتی ہیں۔ بچوں کے خیالات، تجربات، احساسات اور جذباتی و نفسیاتی تقاضے بڑوں سے مختلف ہوتے ہیں۔ اس لیے بچوں کے ادب کا بڑوں کے ادب سے مختلف اور جدا نوعیت کا ہونا ضروری ہے۔ اس لیے بچوں کے لیے لکھی گئی کتابیں ایسی ہونی چاہئیں جو ان کی تربیت کرنے کے ساتھ ساتھ انھیں ذہنی سکون اور تفریح مہیا کریں، ان کی صلاحیتوں کو جلا دیں اور زبان پر عبور حاصل کرنے میں مددگار ثابت ہوں۔

شفیع الدین نیّر نے اپنے مقالے 'اردو زبان میں بچوں کا ادب' میں لکھا ہے کہ "بچوں کے ادب سے مراد نظم ونثر کا وہ ذخیرہ ہے جو خاص طور پر بچوں کے لیے لکھا گیا ہو یا اپنی معنویت اور افادیت کے اعتبار سے بچوں کے لیے موزوں ہو یا یوں سمجھیے کہ جو ادب چار یا پانچ سال کی عمر سے تیرہ چودہ برس تک کے بچوں کے لیے مخصوص ہو، اسے ہم بچوں کے ادب سے تعبیر کرسکتے ہیں۔" اس تعریف سے بھی یہ نکتہ واضح ہوتا ہے کہ بچوں کا ادب، نوعیت کے لحاظ سے بڑوں کے ادب سے مختلف ہوتا ہے۔

یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ بچوں کا ادب، بڑوں کے ادب سے ذہنی، لسانی اور عمر کے اعتبار سے مختلف ہوتا ہے۔ اس ادب کی تخلیق میں بعض امور کا خیال رکھنا بہت ضروری ہے۔ بچہ جب پرائمری اسکول میں پڑھتا ہے، اس وقت وہ زبان سیکھنے کی منزل میں ہوتا ہے، اس لیے اس عمر کے بچوں کے لیے ایسی کتابیں ہونی چاہئیں جن کی زبان آسان اور عام فہم ہو، ان میں رنگین، دلکش اور واضح تصاویر ہوں۔ باتصویر کتابیں بچوں کے شعور کو اپیل کرتی ہیں اور ان کے خیالات و جذبات کو بھی متاثر کرتی ہیں۔ اس عمر کے بچوں میں تجسس کا مادہ زیادہ ہوتا ہے، اس لیے وہ تخیلی کہانیاں جیسے جنوں اور پریوں کی کہانیاں زیادہ شوق سے سنتے ہیں۔ اس عمر کے بچوں کو ایسی نظمیں زیادہ پسند آتی ہیں جن میں غنائیت ہو، خواہ ان کا مفہوم سمجھ میں نہ آئے۔ اس لیے ان بچوں کے لیے مترنم بحروں والی نظمیں لکھی جائیں تاکہ انھیں آسانی سے یاد کرسکیں اور گنگنا سکیں۔

جب بچہ نو دس برس کا ہوجاتا ہے تو وہ اپنے آس پاس کی دنیا کو سمجھنے لگتا ہے اور فطرت کے مشاہدے میں زیادہ دلچسپی لیتا ہے۔ اس میں مختلف افراد اور اشیا کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنے کا شوق بڑھ جاتا ہے۔ اس لیے اس عمر کے بچوں کے لیے اجنبی مقامات، بزرگوں، تاریخی ہستیوں سے متعلق معلوماتی مضامین اور کہانیاں تحریر کی جاسکتی ہیں۔ بعض واقعات، تجربات اور حادثات پر مبنی ڈرامے بھی لکھے جاسکتے ہیں۔ اس منزل کے لیے تخلیق کردہ ادب کی سب سے اہم خوبی حیرت و استعجاب ہے جو بچے کے ذہن میں پیدا ہونے والے کیا، کیوں، کیسے وغیرہ سوالات کی تشفی کرتے ہیں۔ گیارہ، بارہ برس کا بچہ کافی باشعور ہوجاتا ہے۔ وہ اپنے گردوپیش کی دنیا، معاشرہ و ماحول، افرادِ خاندان سے کافی حد تک واقف ہوجاتا ہے، اس میں

بھلے برے کی تمیز آجاتی ہے۔ اس کے ذخیرۂ الفاظ میں وسعت، خیالات میں بلندی، تجربات میں تنوع اور اعتماد میں پختگی آجاتی ہے۔ دراصل اسی منزل پر بچّے کی شخصیت اور کردار کی تعمیر ہوتی ہے، اس کے مزاج اور عادات و اطوار میں پختگی آتی ہے، اس لیے اس عمر کے بچّوں کے لیے مشاہیر اور عظیم ہستیوں کے کارناموں، اخلاقی و ادبی موضوعات پر مشتمل مضامین اور کتابیں، تاریخی ناول اور ڈرامے، جوشیلی نظمیں تخلیق کی جانی چاہئیں۔

بچّوں کے ادب کی زبان مختلف منازل کی مناسبت سے 'آسان' سے 'مشکل' کی جانب ارتقا پذیر ہونی چاہیے لیکن اسلوب نگارش ایسا ہو کہ بچّے شوق سے ان تخلیقات کا مطالعہ کریں اور ان کو پڑھ کر لطف اندوز ہوں۔ بچّوں کے ادب کی دوسری اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں اخلاقی اقدار کی نشوونما اور کردار سازی کا خیال رکھا گیا ہو۔ علاوہ ازیں ان میں حب الوطنی، اتحاد و اتفاق، ہمدردی وتعاون اور قومی یکجہتی کے جذبات پروان چڑھیں۔ بچّوں کے ادب کی تیسری لیکن اہم خصوصیت موضوع کا تنوع ہے۔ بچّے ایک ہی طرح کی چیزیں پڑھ کر اکتا جاتے ہیں۔ وہ ہمیشہ تبدیلی کے خواہشمند ہوتے ہیں، اس لیے بچّوں کے ادب میں موضوعات کی رنگارنگی ہونی چاہیے۔ موضوعات کے انتخاب میں اس امر کا خاص خیال رکھا جائے کہ وہ بچّوں کی عمر سے ہم آہنگ ہوں۔ موضوع کے تمام پہلوؤں کو خوبصورتی اور فنی چابکدستی کے ساتھ پیش کرنا چاہیے جنھیں بچّے بآسانی سمجھ سکیں اور انھیں یاد رکھ سکیں۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ دنیا کی تقریباً سبھی زبانوں میں بچّوں کے ادب کی تاریخ میں یکسانیت پائی جاتی ہے۔ چھاپہ خانہ کی ایجاد سے قبل بچّے اپنے بزرگوں سے کہانیاں سنا کرتے تھے۔ طباعت کا آغاز ہونے کے بعد بھی بچّوں کے لیے بہت کم کتابیں لکھی گئیں، اس لیے بچّے، بڑوں کے لیے تحریر کردہ کتابیں ہی پڑھتے تھے۔ ان کے لیے سب سے پہلے تعلیمی موضوعات پر کتابیں لکھی گئیں اور یہی ان کے لیے درسی کتب کی حیثیت رکھتی تھیں۔ بعض اہلِ علم بچّوں کی درسی کتابوں کے لیے لکھی گئی تخلیقات کو 'ادب' میں شمار نہیں کرتے لیکن غیر جانبداری سے جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ درحقیقت درسی کتب کے بطن ہی سے بچوں کا ادب ظہور پذیر ہوا ہے۔ جب پہلے پہل زبان کی تدریس کے لیے درسی کتب تیار کی گئیں تو مرتّب کو احساس ہوا کہ بچّوں کی عمر اور ذہنی استعداد کے مطابق نثر و نظم کے نمونے موجود نہیں ہیں، تب ادب اطفال کی تخلیق کی جانب شعوری طور پر توجہ دی گئی۔

اردو کے قدیم شاعروں میں صرف نظیر اکبرآبادی نے بچّوں کے لیے بھی لکھا ہے۔ نظیر نے دراصل اپنے شاگردوں کی فرمائش پر ان کی دلچسپیوں اور رجحانات کے تحت آسان اور دلچسپ نظمیں لکھیں نیز انھوں نے بچّوں کی شخصیت کی تعمیر اور کردار سازی، اخلاقی اقدار اور قومی تشخص کی نشوونما، جانوروں سے محبت، مصیبت زدہ انسانوں سے ہمدردی، ایمانداری اور سچائی، ہندستانی تہذیب وتمدن کے مظاہر، ہندستانی موسم اور تہواروں جیسے موضوعات پر موثر نظمیں لکھی ہیں۔ ایامِ طفلی، تربوز، گلہری کا بچہ، ہرن کا بچہ، ہنس، بسنت، شب برات، دیوالی وغیرہ ان کی مشہور نظمیں ہیں جو آج بھی درسیات میں شامل کی جاتی ہیں۔ قدیم ادیبوں میں میر امّن کی کتاب ''چہار درویش'' کو بھی بچّوں کے ادب میں شمار کرسکتے ہیں کیونکہ اس میں سیر وسیاحت کے شوق کو بڑھاوا دینے کے ساتھ ساتھ بچّوں کے ذوقِ تجسّس کو بھی ابھارا گیا ہے نیز اس کی زبان سادہ وشیریں ہے۔ البتہ اس کتاب کے بیشتر حصے، دلچسپی کے لحاظ سے، بچّوں کو پوری طرح باندھ کر رکھ نہیں پاتے۔

نظیر اکبرآبادی اور میر امن کی تحریروں کے بعد کچھ عرصے تک اردو میں ایسا کوئی قابلِ ذکر ادب پارہ نہیں ملتا جو خاص طور پر بچّوں کے لیے تخلیق کیا گیا ہو۔ یہاں تک کہ جب کرنل ہالرائڈ (ڈائرکٹر، سررشتۂ تعلیم، پنجاب) کی فرمائش پر مولانا محمد حسین آزاد نے اردو کی درسی کتابیں مرتب کیں تو انھیں ایسی نظمیں اور اسباق حاصل نہیں ہوسکے جو بچّوں کی نفسیات، دلچسپیوں اور رجحانات کے مطابق ہوں۔ مجبوراً انھوں نے خود کئی نظمیں لکھیں، کہانیاں اور مضامین تحریر کیے اور انھیں شاملِ کتاب کیا۔ درحقیقت یہیں سے بچّوں کے ادب کی تخلیق کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ مولانا نے 1868 میں 'اردو کی پہلی کتاب' اور 'اردو کی دوسری کتاب' شائع کی تھیں۔ یہ کتابیں انگریزی ریڈروں کی طرز پر باقاعدہ اور سلیقے سے مرتب کی گئی تھیں۔ ان میں تصویریں بھی شامل تھیں۔ موصوف نے ادب اطفال کی بنیاد رکھ دی تھی۔ ان کے معاصرین اور بعد کے اہلِ قلم نے اس عمارت کی تعمیر وتوسیع کا کام جاری رکھا۔ ان لکھنے والوں میں مولانا حالی، مولوی اسمٰعیل میرٹھی، منشی پریم چند، حامد اللہ افسر میرٹھی، مرزا عظیم بیگ چغتائی، ڈاکٹر ذاکر حسین، عبدالمجید بھٹی، حفیظ جالندھری، تلوک چند محروم، شفیع الدین نیر، حسین حسان، عبدالواحد سندھی، کرشن چندر، امتیاز علی تاج وغیرہ خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ ادب اطفال کے فروغ میں بعض رسائل و جرائد کا اہم کردار رہا ہے۔ مثلاً ہفتہ وار 'پریم' لاہور (مدیران: مولانا تاجور نجیب آبادی اور لالہ چرنجیو لال ماتھر)، ہفتہ وار 'نونہال' (مدیر: حکیم احمد شجاع)، ہفتہ وار 'پھول' (مدیرہ: نذر سجاد حیدر)، ہفتہ وار 'خیر اندیش'، مالیگاؤں (مدیر: خیال انصاری)، ماہنامہ 'غنچہ' بجنور، ماہنامہ 'شگوفہ' ناگپور، ماہنامہ 'کلیاں' لکھنؤ، ماہنامہ 'بچّوں کی دنیا' الٰہ آباد، ماہنامہ 'کھلونا' دہلی، ماہنامہ 'پیامِ تعلیم' دہلی، ماہنامہ 'امنگ' دہلی، وغیرہ۔ بعض طباعتی ادارے بھی خصوصی طور پر بچّوں کے لیے عمدہ کتابیں شائع کررہے ہیں۔ مثلاً نیشنل بک ٹرسٹ، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ وغیرہ۔ شکر ہے کہ موجودہ زمانے میں اس پر خصوصی توجہ دی جارہی ہے۔

Special Officer for Urdu
M.S. Bureau of Textbooks, Balbharati,
Senapati Bapat Marg, PUNE-411004 (M.S.)

تحریر: دیپوش مجمدار
ترجمہ: معین الدین خاں

بچوں کے لیے قومی کمیشن کی تشکیل

مرکزی وزیر برائے فروغ انسانی وسائل ڈاکٹر مرلی منوہر جوشی پارلیمنٹ کے سہ ماہی اجلاس میں بچوں کے حقوق کے تحفظ اور ان کی فلاح و بہبود کے لیے دو نئے بل پیش کر رہے ہیں۔

ڈاکٹر مرلی منوہر جوشی بچوں کے لیے مفت اور لازمی تعلیمی بل تو لے کر تیار بیٹھے ہیں۔ یہ بل تعلیم کے حق کو یقینی بنائے گا، جس کی ضمانت آئین کی 86ویں ترمیم میں دی گئی ہے۔

وزارت برائے فروغ انسانی وسائل کے خواتین اور بچوں کے محکموں کے افسران نے ایک ایسے بل کا مسودہ تیار کیا ہے جس کے نتیجے میں بچوں کا قومی کمیشن تشکیل دیا جا سکے گا۔ ایک ایکشن پلان، جس کو ''بچوں کا قومی منشور'' نام دیا گیا ہے، کو مرکزی کابینہ اس سال کے اوائل میں ہی اپنی منظوری دے چکی ہے، اسے بھی پارلیمنٹ کے سامنے رکھا جائے گا۔

افسران کا کہنا ہے کہ قانونی منصوبہ بندی اور مسودہ سازی کا عمل پچھلے تین برسوں سے چل رہا تھا اور اب ان کو حتمی شکل دی جا رہی ہے۔

بچوں کے کمیشن کو دیگر قومی کمیشنوں مثلاً عورتوں اور اقلیتوں، کے رہنما خطوط پر استوار کیا جا رہا ہے۔ اس بل کے تیسرے باب میں یہ درج ہے کہ کمیشن ''بچوں کے تحفظات سے متعلق تمام متعلقہ امور پر موجودہ قانون کے تحت جانچ اور تفتیش کر سکے گی۔ یہ کمیشن متعینہ مدت پر تحفظات کی کارکردگی سے متعلق مرکزی حکومت کو رپورٹ پیش کر سکے گی۔ اس کو یہ حق بھی حاصل ہوگا کہ یہ موجودہ پالیسیوں، پروگراموں (بچوں کے لیے) پر نظرِ ثانی کر سکے اور ان کے موثر نفاذ کے لیے سفارشات پیش کر سکے۔ یہ ملک بھر کے بچوں کے نگہداشتی گھروں (Juvenile Custodial Home) کا جائزہ لے سکتی ہے۔

کمیشن کو صرف الزامات کے جانچ کی ہی اجازت نہیں دی گئی ہے بلکہ یہ بچوں کے حقوق سے محرومی، بچوں کے فروغ کے قانون پر عمل درآمد نہ ہونے اور پالیسیوں، رہنما خطوط یا ہدایات، جن کا مقصد بچوں کی فلاح و بہبود سے ہے، پر عمل درآمد نہ ہونے کی صورت میں خود بخود اقدام کرنے کی اہلیت رکھتی ہے۔ کمیشن کو مقدمے کے سلسلے میں کسی شخص کو سمن جاری کرنے، اس سے پوچھ تاچھ کرنے یا پھر اس سے دستاویز طلب کرنے کے معاملے میں سول کورٹ کے مساوی اختیار دیا گیا ہے۔

کمیشن کا چیئرمین وہ شخص ہوگا جو یا تو سپریم کورٹ کا جج ہے یا رہ چکا ہے یا پھر کوئی ممتاز شخصیت جس نے بچوں کی فلاح و بہبود کے سلسلے میں غیر معمولی کام کیا ہو۔ اس کمیشن میں چیئرپرسن کے علاوہ دیگر چھ رکن ہوں گے، جن کا تعلق تعلیم، بچوں کی صحت، بچوں کے انصاف (Juvenile Justice)، بچہ مزدوری کے خاتمے اور بچوں کی نفسیات سے ہو۔

بچوں کے قومی منشور میں بچوں کی فلاح و بہبود سے متعلق حکومت کے ذریعے سلسلہ وار اٹھائے جانے والے اقدام کا ذکر ہے۔ مثال کے لیے ''بقا، زندگی اور آزادی'' کے عنوان کے تحت یہ کہا گیا ہے کہ ریاست اور معاشرہ طفل کشی اور جنین کشی، خصوصاً مادہ جنین اور وہ تمام مظاہر جن کے ذریعے بچیوں کو ان کے حقوق سے محروم کیا جاتا ہے، جیسے سبھی مسئلوں پر مناسب اقدام اٹھا کر اس کو حل کریں گے۔ منشور میں ''صحت اور غذائیت کے اعلا معیار کے فروغ'' پر ایک علاحدہ باب ہے۔ ''کم سے کم بنیادی ضرورت اور تحفظ کی یقین دہانی'' کے باب میں یہ عہد درج ہے کہ ریاست اور معاشرے کے تعاون سے بچوں، خصوصاً گلیوں اور محلوں میں رہنے والے اور ٹھکرائے ہوئے بچوں کو سماجی تحفظ فراہم کیا جائے گا۔

قومی منشور میں ہر گاؤں میں بچوں کی نگہداشت کے مراکز کھولنے کی ضرورت کو تسلیم کیا گیا ہے، جہاں نوزائیدہ بچے اور کام کرنے والی عورتوں کے بچوں کا مناسب ڈھنگ سے خیال رکھا جا سکے۔ یہ منشور ہر قسم کی بچہ مزدوری کے مکمل خاتمے کا وعدہ کرتا ہے۔ بچیوں کے تحفظ کے باب میں کم عمر بچیوں کی شادی کے خلاف آواز اٹھائی گئی ہے۔

(بشکریہ ''انڈین ایکسپریس'' 3 نومبر 2003)

□□□

بھرت جھن جھن والا

کان کن مذاکرات اور زراعت

اروں جیٹلی اور اٹل بہاری واجپئی کو مبارکباد۔ عالمی تجارتی تنظیم کے کان کن مذاکرات ناکام ہوگئے ہیں۔ غریب ممالک کا مطالبہ تھا کہ امیر ممالک اپنے کسانوں کو بڑے پیمانے پر دی جارہی سبسڈی ختم کریں۔ اس سبسڈی کے سہارے ان کے کسان بازار میں اپنا مال کم قیمت پر بیچ رہے ہیں کیونکہ سبسڈی سے ان کی آمدنی یقینی ہے۔ اس سے عالمی بازار میں زرعی پیداواروں کی قیمتیں کم ہوجاتی ہیں اور غریب ممالک کا کسان مارا جاتا ہے حالانکہ وہ امیر ممالک کے کسانوں کے مقابلے میں سستا مال بناتا ہے۔ افریقہ کے ممالک کی یہ خاص شکایت تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ امیر ممالک کپاس کو کم قیمت پر بیچ رہے ہیں جس سے ان کے کسان پریشانی میں ہیں۔

مذاکرات کی ناکامی کا دوسرا سبب سرمایہ کاری کی پالیسی تھی۔ امیر ممالک کا مطالبہ تھا کہ عالمی سرمائے کو کھلا چھوڑ دینا چاہیے جس سے وہ ان ممالک میں بے روک ٹوک جاسکے جہاں زیادہ سے زیادہ فائدہ ہو۔ ان کا کہنا تھا کہ عالمی سرمائے کو فائدہ ہونے سے پوری دنیا کو فائدہ ہوگا اور غریبی دور ہوگی۔ لیکن غریب ممالک نے اس دلیل کو تسلیم نہیں کیا۔ انھوں نے کہا کہ اس بات کی گارنٹی نہیں ہے کہ سرمائے کو کھلی چھوٹ دینے سے غریب ممالک کو فائدہ ہوگا۔ اس کے برعکس یہ بھی ممکن ہے کہ چھوٹ مل جانے سے غریب ممالک کا سرمایہ امیر ممالک کی طرف بھاگنے لگے۔ واضح رہے کہ عالمی بینک کی گلوبل فنانس رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ گذشتہ دو برسوں میں غریب ممالک سرمائے کے برآمد کار بن گئے ہیں۔ قانونی اور غیر قانونی ڈھنگ سے ان کا سرمایہ امیر ممالک کی طرف بھاگ رہا ہے۔ جتنا سرمایہ انھیں غیر ملکی سرمایہ کاری سے مل رہا ہے اس سے زیادہ ان کا سرمایہ باہر جارہا ہے۔ اس حقیقت کو دیکھتے ہوئے غریب ممالک نے کہا کہ عالمی تجارتی تنظیم کا دائرہ تجارت کی توسیع تک محدود رکھنا چاہیے۔ سرمایہ کاری، مقابلہ آرائی کی پالیسی، سرکاری خریداری، ماحولیاتی معیار اور محنت جیسے ایشوز کو ڈبلیو ٹی او سے باہر رکھنا چاہیے، لیکن امیر ممالک کی ضد تھی کہ انھیں ڈبلیو ٹی او میں شامل کیا ہی جانا چاہیے۔

مذاکرات کی ناکامی کے بعد غریب ممالک کے خیمے میں خوشی کا ماحول تھا جبکہ امیر ممالک میں مایوسی تھی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کان کن میں غریب ممالک کی جیت ہوئی ہے۔ لیکن کئی ماہرین کی رائے ہے کہ غریب ممالک اپنے پیروں پر کلہاڑی مار کر خوش ہورہے ہیں، انھیں جلد پتہ چل جائے گا کہ انھوں نے خسارے کا سودا کیا ہے۔ اس سوال پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ کان کن کے بعد غریب ممالک کا مفاد کیسے حاصل ہوگا۔

یہ درست ہے کہ کان کن کے بعد زرعی مصنوعات کی قیمتوں میں اضافہ نہیں ہوسکے گا۔ امیر ممالک اپنے کسان کو سبسڈی دینے کے لیے آزاد رہیں گے اور زرعی مصنوعات کی بین الاقوامی قیمتیں کم رہیں گی۔ زراعت فائدہ مند نہیں رہے گی۔ یقینی طور پر فی الحال یہ نقصان دہ ہے لیکن اس کے طویل مدتی اثرات پر غور کرنا ہوگا۔

زراعت کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ یہ شعبہ سکڑ رہا ہے۔ پیداوار کرنے والے ممالک کے درمیان مقابلہ آرائی سے عالمی بازار میں زرعی پیداواروں کی قیمتیں کم ہوتی جارہی ہیں۔ ایک مرتبہ کپاس اور گیہوں جیسی فصل کو الگ رکھ دیں جن میں امیر ممالک بھاری سبسڈی دے رہے ہیں۔ کافی چائے اور ربڑ کو لیں۔ امیر ممالک میں ان چیزوں کی پیداوار نہیں ہوتی۔ وہ ان چیزوں پر سبسڈی نہیں دیتے۔ ایسے میں ان کی پیداوار کرنے والے کسان کیوں پریشان ہیں؟ سبب یہ ہے کہ دنیا کی کل آمدنی میں زراعت کا حصہ کم ہوتا جارہا ہے۔ عالمی بینک کے ذریعے دیے گئے اعداد وشمار سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے۔ 1960 میں امیر ممالک کی کل آمدنی میں زراعت کا حصہ 6 فیصد تھا۔ 2003 میں یہ ایک فیصد سے بھی کم رہ گیا۔ 1960 میں غریب ممالک کی کل آمدنی میں زراعت کا حصہ 48 فیصد تھا۔ 2001 میں یہ 23 فیصد رہ گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ زراعت کا بازار سکڑ رہا ہے۔ ایسی حالت میں زراعت کے سہارے ترقی کرنا اسی طرح ہے جیسے ڈوبتی ہوئی کشتی سے ندی پار کرنا۔ زرعی پیداواروں کی اہمیت ہی کم ہورہی ہے۔ ایسی حالت میں اگر امیر ممالک سبسڈی دینا بند کردیں اور ان کی قیمت میں معمولی اضافہ ہوجائے تو بھی کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا کیونکہ بنیادی طور پر زراعت دباؤ میں ہے اور غریب ممالک اس سکڑتے بازار میں آپسی مقابلہ آرائی میں لگے ہوئے ہیں۔ زراعت کا موازنہ کمہار سے کیا جاسکتا ہے۔ گاؤں میں پہلے المونیم کے گھڑوں کا رواج ہوا اور اس کے بعد پلاسٹک کے گھڑوں کا۔ مٹی کے گھڑوں کا بازار سکڑتا جارہا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ کمہار مٹی کے برتن بنانے میں مہارت حاصل کرے اور اسی کام کو کرے تو اس کی کیا معنویت ہے؟ اگر کمہار کہے کہ مٹی کے برتنوں کے عالمی بازار میں کھلا پن لایا جائے تو اس کا کیا مطلب ہے؟ اگر مٹی کے برتن کا بازار پوری طرح کھول دیا گیا تو بھی کمہار کے ہاتھ کچھ نہیں آئے گا، کیونکہ مٹی کے برتنوں کی مانگ کم ہے اور سپلائی زیادہ۔ تقریباً یہی

حالت کھیتی کی ہے۔

امیر ممالک اپنے کسانوں کو دی جانے والی سبسڈی ختم کردیں تو بھی کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا۔ کیونکہ کھیتی کا بازار خود سکڑ رہا ہے۔ برازیل، ہندستان اور ویتنام کافی کے سکڑتے بازار میں اپنی بالادستی قائم کرنے کی جدوجہد میں مصروف ہیں۔ جس سے کافی کی قیمتیں گرتی جارہی ہیں۔ کپاس اور گیہوں میں امیر ممالک سبسڈی دینا بند کردیں تو بھی ان پیداواروں کی قیمت میں گراوٹ جاری رہے گی۔ سبسڈی ختم ہونے کے بعد ایک مرتبہ کپاس کی قیمت میں کچھ اضافہ ضرور ہوگا لیکن جلد ہی پیدا کرنے والے ممالک کے ذریعے سپلائی زیادہ ہونے کے سبب اس میں دوبارہ گراوٹ آئے گی۔ مطلب یہ ہے کہ زراعت کی کشتی ڈوب رہی ہے۔ اس کشتی کو بچانے میں دم نہیں ہے۔ اس کے سہارے ندی کو پار نہیں کیا جاسکتا ہے۔ ندی پار کرنی ہے تو ڈوبتی ناؤ میں سے چھلانگ لگا کر دوسرے اسٹیمر کو پکڑ لینا چاہیے جس کا مستقبل اچھا ہو۔

کھلی عالمی تجارت یقیناً سب کے لیے فائدہ مند ہوتی ہے، لیکن کھلے بازار کا اصول یہ بھی کہتا ہے کہ جس مال کو تیار کرنے میں فائدہ نہ ہو اسے چھوڑ دینا چاہیے۔ غریب ممالک یہ غلطی کررہے ہیں کہ اس بازار کی طرف توجہ مرکوز کررہے ہیں جو سکڑ رہا ہے۔ آج سروس سیکٹر کا بازار بڑھ رہا ہے۔ مثلاً تعلیم، صحت، تفریح، سافٹ ویئر، کال سینٹر وسیاحت وغیرہ۔ غریب ممالک کو بالآخر ان شعبوں میں مہارت حاصل کرنی ہی ہوگی۔ دیکھنا یہ ہے کہ کان کن کی ناکامی کا اس پر کیا اثر پڑے گا۔

کان کن کی ناکامی کے دو مثبت اثرات ہوں گے۔ پہلا یہ کہ جلد ہی کھیتی سے لگاؤ میں کمی آئے گی۔ کمہار کو اگر امید دلا دی جائے کہ عالمی بازار کھلنے والا ہے تو وہ دیگر کاموں میں دلچسپی نہیں لے گا اور مٹی کے برتن بنانے میں ہی لگا رہے گا۔ اسے معلوم ہوجائے کہ عالمی بازار کھلنے والا نہیں ہے تو وہ دیگر کاموں میں مہارت حاصل کرنے کی کوشش کرے گا۔ دوسرا اثر یہ ہوگا کہ نئے شعبوں میں مہارت حاصل کرنے کے لیے اپنے لوگوں کو ہم ضروری تحفظ دے سکیں گے۔ کمہار کے بیٹے کو اگر کال سینٹر چلانا سکھانا ہے تو اسے وظیفہ دینا ہوگا۔ کان کن کی ناکامی سے وظیفہ دینے یعنی اپنی صنعتوں کو تحفظ دینے کی چھوٹ غریب ممالک کو ملتی رہے گی۔ لیکن غریب ممالک کی سرکاروں کے سامنے چیلنج یہ ہے کہ وہ اس چھوٹ کو اپنے عوام سے لوٹ کھسوٹ میں نہ لگا کر انھیں صحیح سمت میں لگانے کی کوشش کریں۔ کان کن نے ایسا کرنے کا راستہ صاف کردیا ہے۔ اس پالیسی کو صرف نافذ کرنے کی ضرورت ہے۔

723, Modern Society, Sector 15, Rohini,
Post Box 10754, Delhi-110085

□□□

پروفیسر محمد حسن

ادبی سماجیات ایک نئے علم کی حیثیت سے حال ہی میں سامنے آئی ہے۔ یہ کتاب اردو میں ادبی سماجیات کے مطالعے کی پہلی کوشش ہے جو اس کے تمام اہم پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہے۔

پہلی اشاعت

334 صفحات، قیمت: 98.00 روپے

ڈاکٹر کمال احمد صدیقی

مصنف برسوں تک آل انڈیا ریڈیو میں ذمے دارانہ عہدوں پر رہے ہیں، انھوں نے باریک بینی کے ساتھ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی زبان پر گفتگو کی ہے۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے قلم کاروں کے لیے یہ کتاب خصوصی افادیت رکھتی ہے۔

پہلی اشاعت

646 صفحات، قیمت: 200.00 روپے

مرتب: پروفیسر محمد حسن

1947ء سے 1990 تک اردو میں لکھے جانے والے ڈراموں کا ایک نمائندہ انتخاب جن میں تاریخی، نیم تاریخی، سماجی اور سراسر تخیلی ڈرامے بھی شامل ہیں۔ ابتدا میں فاضل مرتب نے ڈرامے کے فن اور اس کی روایت پر بھرپور گفتگو کی ہے۔

پہلی اشاعت

600 صفحات، قیمت: 156.00 روپے

رشید الدین خاں

اس کتاب میں مولانا آزاد کی زندگی کے سوانحی گوشوں پر بہ طور خاص روشنی ڈالی گئی ہے۔

صفحات: 684، قیمت: 58.00 روپے

رشید الدین خاں

مولانا آزاد کی ہمہ جہت شخصیت اور ان کے علمی اور عملی کارناموں کا مکمل تعارف۔

(دوسرا ایڈیشن)، صفحات: 336، قیمت: 76.00 روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک-1، ونگ-8، آر۔کے۔ پورم، نئی دہلی-110066

سعادت حسن منٹو

جی آیا صاحب

باورچی خانے کی دھندلی فضا میں بجلی کا ایک اندھا قمقمہ چراغِ گور کی مانند اپنی سُرخ روشنی پھیلا رہا تھا۔ دھوئیں سے اٹی ہوئی دیواریں ہیبت ناک دیووں کی طرح انگڑائیاں لیتی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں — چبوترے پر بنی ہوئی انگیٹھیوں میں آگ کی آخری چنگاریاں اُبھر اُبھر کر اپنی موت کا ماتم کر رہی تھیں، ایک برقی چولھے پر رکھی ہوئی کیتلی کا پانی نہ معلوم کس چیز پر خاموش ہنسی ہنس رہا تھا — دور کونے میں۔ پانی کے نل کے پاس ایک چھوٹی عمر کا لڑکا بیٹھا برتن صاف کرنے میں مشغول تھا۔ یہ انسپکٹر صاحب کا نوکر تھا۔

برتن صاف کرتے وقت یہ لڑکا کچھ گنگنا رہا تھا۔ یہ الفاظ ایسے تھے جو اس کی زبان سے بغیر کسی کوشش کے نکل رہے تھے۔

"جی آیا صاحب! جی آیا صاحب! — بس ابھی صاف ہو جاتے ہیں صاحب۔"

ابھی برتنوں کو راکھ سے صاف کرنے کے بعد انھیں پانی سے دھو کر قرینے سے رکھنا بھی تھا اور یہ کام جلدی سے نہ ہو سکتا تھا۔ لڑکے کی آنکھیں نیند سے بند ہوئی جا رہی تھیں۔ سر سخت بھاری ہو رہا تھا مگر کام کیے بغیر آرام — یہ کیوں کر ممکن تھا؟

برقی چولھا بدستور ایک شور کے ساتھ نیلے شعلوں کو اپنے حلق سے اُگل رہا تھا۔ کیتلی کا پانی اسی انداز میں کھل کھلا کر ہنس رہا تھا۔

دفعتاً لڑکے نے نیند کے ناقابلِ مغلوب حملے کو محسوس کرتے ہوئے اپنے جسم کو ایک جنبش دی اور "جی آیا صاحب، جی آیا صاحب" گنگناتا ہوا پھر کام میں مشغول ہو گیا۔

دیوار گیروں پر چنے ہوئے برتن اس لڑکے کو ایک غیر مختتم ٹکٹکی لگائے دیکھ رہے تھے۔ پانی کے نل سے روزانہ ایک ہی واقعہ دیکھ کر قطروں کی صورت میں آنسو ٹپ ٹپ گر رہے تھے۔ بجلی کا قمقمہ حیرت سے اس لڑکے کی طرف دیکھ رہا تھا — کمرے کی فضا سسکیاں بھرتی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔

"قاسم — قاسم۔"

"جی آیا صاحب۔" لڑکا جو انھی الفاظ کی گردان کر رہا تھا، بھاگا ہوا اپنے آقا کے پاس گیا۔

انسپکٹر صاحب نے کمبل سے منہ نکالا اور لڑکے پر خفا ہوتے ہوئے کہا۔

"بیوقوف کے بچے! آج پھر یہاں صراحی اور گلاس رکھنا بھول گیا ہے۔"

"ابھی لایا صاحب۔ ابھی لایا صاحب۔"

کمرے میں صراحی اور گلاس رکھنے کے بعد وہ ابھی برتن صاف کرنے کے لیے بیٹھا ہی تھا کہ پھر اُس کمرے سے آواز آئی۔

"قاسم — قاسم۔"

"جی آیا صاحب۔" قاسم بھاگتا ہوا اپنے آقا کے پاس گیا۔

"بمبئی کا پانی کس قدر خراب ہے۔ جاؤ پارسی کے ہوٹل سے سوڈا لے کر آؤ۔ بس بھاگے ہوئے جاؤ۔ سخت پیاس لگ رہی ہے۔"

"بہت اچھا صاحب۔"

قاسم بھاگا ہوا گیا اور پارسی کے ہوٹل سے جو گھر سے تقریباً نصف میل کے فاصلے پر واقع تھا، سوڈے کی بوتل لے آیا اور اپنے آقا کو گلاس میں ڈال کر دے دی۔

"اب تم جاؤ۔ مگر اس وقت تک کیا کر رہے ہو۔ برتن صاف نہیں ہوئے کیا؟"

"ابھی صاف ہو جاتے ہیں صاحب۔"

"اور ہاں برتن صاف کرنے کے بعد میرے سیاہ بوٹ کو پالش کر دینا مگر دیکھنا احتیاط رہے۔ چمڑے پر کوئی خراش نہ آئے۔ ورنہ —"

قاسم کو "ورنہ" کے بعد کا جملہ بخوبی معلوم تھا۔ "بہت اچھا صاحب۔" کہتے ہوئے وہ باورچی خانے میں واپس چلا گیا، اور برتن صاف کرنے شروع کر دیے۔

اب نیند اُس کی آنکھوں میں کھنچی چلی آ رہی تھی۔ پلکیں آپس میں ملی جا رہی تھیں۔ سر میں سیسہ اُتر رہا تھا۔ یہ خیال کرتے ہوئے — کہ صاحب کے بوٹ بھی ابھی پالش کرنے ہیں۔ قاسم نے اپنے سر کو زور سے جُنبش دی اور وہی راگ الاپنا شروع کر دیا۔

"جی آیا صاحب، جی آیا صاحب! بوٹ ابھی صاف ہو جاتے ہیں صاحب۔"

مگر نیند کا طوفان ہزار بند باندھنے پر بھی نہ رُکا۔ اب اُسے محسوس ہونے لگا کہ نیند ضرور غلبہ پا کر رہے گی۔ لیکن ابھی برتنوں کو دھو کر انھیں اپنی اپنی جگہ

پر رکھنا باقی تھا۔ اس وقت ایک عجیب خیال اس کے دماغ میں آیا۔ ''بھاڑ میں جائیں برتن اور چولھے میں جائیں بوٹ، کیوں نہ تھوڑی دیر اسی جگہ سو جاؤں اور پھر چند لمحات آرام کرنے کے بعد —''

اس خیال کو باغیانہ تصور کرتے ہوئے قاسم نے ترک کر دیا اور برتنوں پر جلدی جلدی راکھ ملنا شروع کر دی۔

تھوڑی دیر کے بعد جب نیند پھر غالب آئی تو اس کے جی میں آیا کہ اُبلتا ہوا پانی اپنے سر پر انڈیل لے اور اس طرح اس غیر مرئی طاقت سے جو اس کے کام میں حارج ہو رہی تھی، نجات پا جائے۔ مگر اتنا حوصلہ نہ پڑا۔

بمشکل منہ پر پانی کے چھینٹے مار مار کر اُس نے سب برتنوں کو بالآخر صاف کر ہی لیا۔ یہ کام کرنے کے بعد اُس نے اطمینان کا سانس لیا۔ اب وہ آرام سے سو سکتا تھا۔ اور نیند — وہ نیند، جس کے لیے اس کی آنکھیں اور دماغ اس شدت سے انتظار کر رہے تھے۔ اب بالکل نزدیک تھی۔

باورچی خانے کی روشنی گل کرنے کے بعد قاسم نے باہر برآمدے میں اپنا بستر بچھایا اور لیٹ گیا۔ اور اس سے پہلے کہ نیند اُسے اپنے آرام دہ بازوؤں میں تھام لے۔ اس کے کان ''بوٹ، بوٹ'' کی آوازوں سے گونج اُٹھے۔

''بہت اچھا صاحب — ابھی پالش کرتا ہوں۔'' بڑبڑاتا ہوا قاسم بستر پر سے اُٹھا۔ جیسے اُس کے آقا نے ابھی بوٹ روغن کرنے کے لیے حکم دیا ہے۔

ابھی قاسم بوٹ کا ایک پیر بھی اچھی طرح پالش کرنے نہ پایا تھا کہ نیند کے غلبے نے اُسے وہیں پر سلا دیا۔

سورج کی خونیں کرنیں اس مکان کے شیشوں سے نمودار ہوئیں — قاسم کی کتابِ حیات میں ایک اور پُر از مشقت باب کا اضافہ ہو گیا۔

صبح جب انسپکٹر صاحب نے اپنے نوکر کو باہر برآمدے میں بوٹوں کے پاس سویا ہوا دیکھا تو اُسے ٹھوکر مار کر جگاتے ہوئے کہا۔ ''یہ سؤر کی طرح یہاں بے ہوش پڑا ہے۔ اور مجھے خیال تھا کہ اس نے بوٹ صاف کر لیے ہوں گے۔ نمک حرام! اے قاسم!''

''جی آیا صاحب۔''

''قاسم کے منہ سے اتنا ہی نکلا تھا کہ اُس نے اپنے ہاتھ میں بوٹ صاف کرنے کا برش دیکھا۔ فوراً ہی اس معاملے کو سمجھتے ہوئے اُس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

''میں سو گیا تھا صاحب! مگر۔ مگر بوٹ ابھی پالش ہو جاتے ہیں صاحب۔''

یہ کہتے ہوئے اُس نے جلدی جلدی بوٹ کو برش سے رگڑنا شروع کر دیا۔

بوٹ پالش کرنے کے بعد اُس نے اپنا بستر تہ کیا اور اُسے اوپر کے کمرے میں رکھنے چلا گیا۔

''قاسم''

''جی آیا صاحب۔''

قاسم بھاگا ہوا نیچے آیا۔ اور اپنے آقا کے پاس کھڑا ہو گیا۔

''دیکھو آج ہمارے یہاں مہمان آئیں گے۔ اس لیے باورچی خانے کے تمام برتن اچھی طرح صاف کر رکھنا۔ فرش بھی دُھلا ہوا ہونا چاہیے، اس کے علاوہ تمھیں ملاقاتی کمرے کی تصویروں، میزوں اور کرسیوں کو بھی صاف کرنا ہوگا۔ سمجھے! مگر خیال رہے میری میز پر ایک تیز دھار چاقو پڑا ہوا ہے، اسے مت چھیڑنا! میں اب دفتر جا رہا ہوں۔ مگر یہ کام دو گھنٹے سے پہلے ہو جانا چاہیے۔''

''بہت بہتر صاحب۔''

انسپکٹر صاحب دفتر چلے گئے۔ قاسم باورچی خانہ صاف کرنے میں مشغول ہو گیا۔

ڈیڑھ گھنٹے کی انتھک محنت کے بعد اُس نے باورچی خانے کے تمام کام کو ختم کر دیا اور ہاتھ پاؤں صاف کرنے کے بعد جھاڑن لے کر ملاقاتی کمرے میں چلا گیا۔

وہ ابھی کرسیوں کو جھاڑن سے صاف کر رہا تھا کہ اُس کے تھکے ہوئے دماغ میں ایک تصویر سی کھنچ گئی۔ کیا دیکھتا ہے کہ اس کے گرد و پیش برتن ہی برتن پڑے ہیں اور پاس ہی راکھ کا ایک ڈھیر لگ رہا ہے۔ ہوا زوروں پر چل رہی ہے، جس سے وہ راکھ اُڑ اُڑ کر فضا کو خاکستری بنا رہی ہے۔ یکایک اس ظلمت میں ایک سُرخ آفتاب نمودار ہوا جس کی کرنیں خون آشام برچھیوں کی طرح ہر برتن کے سینے میں گھس گئیں۔ زمین خون سے شرابور ہو گئی — فضا خوشی کے قہقہوں سے معمور ہو گئی۔

قاسم یہ منظر دیکھ کر گھبرا گیا۔ اور اس وحشت ناک خواب سے بیدار ہو کر ''جی آیا صاحب، جی آیا صاحب۔'' کہتا ہوا پھر اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد اُس کی آنکھوں کے سامنے ایک اور منظر رقص کرنے لگا۔ اب اُس کے سامنے چھوٹے چھوٹے لڑکے آپس میں کوئی کھیل کھیل رہے تھے۔ دفعتاً آندھی چلنی شروع ہوئی جس کے ساتھ ہی ایک بدنما اور بھیانک دیو نمودار ہوا جو ان سب لڑکوں کو نگل گیا — قاسم نے خیال کیا کہ وہ دیو اس کے آقا کا ہم شکل تھا مگر قد و قامت کے لحاظ سے وہ اس سے کہیں بڑا تھا۔ اب اس دیو نے زور زور سے ڈکارنا شروع کیا — قاسم سر سے پیر تک لرز گیا۔

ابھی تمام کمرہ صاف کرنا تھا اور وقت بہت کم رہ گیا تھا۔ چنانچہ قاسم نے جلدی جلدی کرسیوں پر جھاڑن مارنا شروع کر دیا۔ ابھی وہ کرسیوں کا کام ختم کرنے کے بعد میز صاف کرنے جا رہا تھا کہ اُسے یکا یک خیال آیا۔ ''آج مہمان آرہے ہیں۔ خدا معلوم کتنے برتن صاف کرنے پڑیں گے۔ اور یہ نیند کمبخت کتنی ستا رہی ہے۔ مجھ سے تو کچھ بھی نہ ہو سکے گا۔''

یہ سوچتے وقت وہ میز پر رکھی ہوئی چیزوں کو پونچھ رہا تھا کہ اچانک اُسے قلمدان کے پاس ایک کھلا ہوا چاقو نظر آیا۔ وہی چاقو جس کے متعلق اُس کے آقا نے کہا تھا کہ بہت تیز ہے۔

چاقو کا دیکھنا تھا کہ اُس کی زبان پر یہ لفظ خود بخود جاری ہو گئے۔ ''چاقو— تیز دھار چاقو!— یہی تمھاری مصیبت کو ختم کر سکتا ہے۔''

کچھ اور سوچے بغیر قاسم نے تیز دھار چاقو اُٹھا اپنی اُنگلی پر پھیر لیا۔ اب وہ شام کے وقت برتن صاف کرنے کی زحمت سے بہت دور تھا۔ اور نیند۔ پیاری، پیاری نیند اب اُسے بآسانی نصیب ہو سکتی تھی۔

اُنگلی سے خون کی سُرخ دھار بہہ رہی تھی۔ سامنے والی دوات کی سُرخ روشنائی سے کہیں چمکیلی۔ قاسم اس خون کی دھار کو مسرّت بھری آنکھوں سے دیکھ رہا تھا اور مُنہ میں یہ گنگنا رہا تھا۔ ''نیند، نیند۔ پیاری نیند۔''

تھوڑی دیر کے بعد وہ بھاگا ہوا اپنے آقا کی بیوی کے پاس گیا جو زنان خانے میں بیٹھی سلائی کر رہی تھی، اور اپنی زخمی اُنگلی دکھا کر کہنے لگا۔ ''دیکھیے بی بی جی۔''

''ارے قاسم یہ تو نے کیا کیا؟۔ کمبخت صاحب کے چاقو کو چھیڑا ہوگا تو نے؟

''بی بی جی۔ بس میز صاف کر رہا تھا اور اس نے کاٹ کھایا'' قاسم ہنس پڑا۔

''اب سور اب ہنستا ہے۔ ادھر آ، میں اس پر کپڑا باندھ دوں— مگر اب بتا تو سہی، آج یہ برتن تیرا باپ صاف کرے گا؟''

قاسم اپنی فتح پر زیر لب مُسکرا رہا تھا۔

اُنگلی پر پٹی بندھوا کر قاسم پھر کمرے میں آ گیا۔ اور میز پر پڑے ہوئے خون کے دھبّوں کو صاف کرنے کے بعد خوشی خوشی اپنا کام ختم کر دیا۔

''اب اس نمک حرام باورچی کو برتن صاف کرنے ہوں گے۔ ضرور صاف کرنے ہوں گے۔ کیوں میاں مٹھو؟'' قاسم نے انتہائی مسرّت میں کھڑکی میں لٹکے ہوئے طوطے سے دریافت کیا۔

شام کے وقت مہمان آئے اور چلے گئے۔ باورچی خانے میں صاف کرنے والے برتنوں کا ایک طومار سا لگ گیا— انسپکٹر صاحب قاسم کی زخمی اُنگلی دیکھ کر بہت برسے اور جی کھول کر گالیاں دیں مگر اُسے مجبور نہ کر سکے۔ شاید اس لیے کہ ایک بار اُن کی اپنی اُنگلی میں قلم تراش کی نوک چبھ جانے سے بہت درد محسوس ہوا تھا۔

آقا کی خفگی آنے والی مسرّت نے بُھلا دی اور قاسم کودتا پھاندتا ہوا اپنے بستر میں جالیٹا۔ تین چار روز تک وہ برتن صاف کرنے کی زحمت سے بچا رہا۔ مگر اُس کے بعد اُنگلی کا زخم بھر آیا۔ اب پھر وہی مصیبت نمودار ہو گئی۔

''قاسم۔ صاحب کی جرابیں اور قمیض دھو ڈالو۔''

''بہت اچھا بی بی جی۔''

''قاسم اس کمرے کا فرش کتنا میلا ہو رہا ہے۔ پانی لا کر ابھی صاف کرو۔ دیکھنا کوئی داغ دھبّہ باقی نہ رہے۔''

''بہت اچھا صاحب۔''

''قاسم شیشے کے گلاس کتنے چکنے ہو رہے ہیں۔ انھیں نمک سے صاف کرو۔''

''جی اچھا صاحب۔''

''قاسم! طوطے کا پنجرہ کس قدر غلیظ ہو رہا ہے۔ اسے صاف کیوں نہیں کرتے؟''

''ابھی کرتا ہوں بی بی جی۔''

''قاسم! ابھی خاک روب آتا ہے۔ تم پانی ڈالتے جانا سیڑھیوں کو دھو ڈالے گا۔''

''بہت اچھا صاحب۔''

''قاسم! ذرا بھاگ کے ایک آنے کا دہی تو لے آنا۔''

''ابھی چلا بی بی جی۔''

پانچ چھ روز اسی قسم کے احکام سننے میں گزر گئے۔ قاسم کام کی زیادتی اور آرام کے قحط سے تنگ آ گیا۔ ہر روز اُسے نصف شب تک کام کرنا پڑتا اور پھر علی الصباح چار بجے کے قریب بیدار ہو کر ناشتے کے لیے چائے تیار کرنی پڑتی۔ یہ کام قاسم کی عمر کے لڑکے کے لیے بہت زیادہ تھا۔

ایک روز انسپکٹر صاحب کی میز صاف کرتے وقت اُس کے ہاتھ خود بخود چاقو کی طرف بڑھے۔ اور ایک لمحے کے بعد اس کی اُنگلی سے خون بہہ رہا تھا۔ انسپکٹر صاحب اور ان کی بیوی قاسم کی یہ حرکت دیکھ کر بہت خفا ہوئے۔ چنانچہ سزا کی صورت میں اسے شام کا کھانا نہ دیا گیا۔ مگر وہ اپنی ایجاد ترکیب کی خوشی میں مگن تھا۔ ایک وقت روٹی نہ ملی۔ اُنگلی پر معمولی سا زخم آ گیا۔ مگر برتنوں کا انبار صاف کرنے سے نجات مل گئی۔ یہ سودا کچھ بُرا نہ تھا۔

چند دنوں کے بعد اُس کی اُنگلی کا زخم ٹھیک ہو گیا۔ اب پھر کام کی وہ

National Council for Promotion of Urdu Language
ACC No. 5176
5/10/04
New Delhi

پھر مار شروع تھی۔ پندرہ بیس روز گدھوں کی سی مشقت میں گزر گئے۔ اس عرصے میں قاسم نے بارہا ارادہ کیا کہ چاقو سے پھر اپنی انگلی زخمی کرلے۔ مگر اب میز پر سے وہ چاقو اُٹھالیا گیا— اور باورچی خانے والی چھری کند تھی۔

ایک روز باورچی بیمار پڑ گیا۔ اب اُسے ہر وقت باورچی خانے میں موجود رہنا پڑتا۔ کبھی مرچیں پیستا، کبھی آٹا گوندھتا، کبھی کوئلوں کو جلا دیتا۔ غرض صبح سے لے کر آدھی رات تک اُس کے کانوں میں "اے قاسم یہ کر، اے قاسم وہ کر" کی صدا گونجتی رہتی۔

باورچی دو روز تک نہ آیا۔ قاسم کی ننھی جان اور ہمت جواب دے گئی۔ مگر سوائے کام کے اور چارہ ہی کیا تھا؟

ایک بار اس کے آقا نے اُسے الماری صاف کرنے کو کہا جس میں ادویات کی شیشیاں اور مختلف چیزیں پڑی ہوئی تھیں۔ الماری صاف کرتے وقت اُسے ڈاڑھی مونڈنے کا ایک بلیڈ نظر آیا۔ بلیڈ کو پکڑتے ہی اس نے اپنی انگلی پر پھیر لیا۔ دھار تھی بہت تیز اور باریک، اُنگلی میں دور تک چلی گئی، جس سے بہت بڑا زخم بن گیا۔ قاسم نے بہت کوشش کی کہ خون نکلنا بند ہوجائے۔ مگر زخم کا منہ بڑا تھا۔ وہ نہ تھما— سیروں خون پانی کی طرح بہہ گیا۔ یہ دیکھ کر قاسم کا رنگ کاغذ کی مانند سپید ہوگیا۔ بھاگا ہوا اپنے آقا کی بیوی کے پاس گیا۔

"بی بی جی، میری انگلی میں صاحب کا اُسترا لگ گیا ہے۔"

جب انسپکٹر صاحب کی بیوی نے قاسم کی انگلی کو تیسری مرتبہ زخمی دیکھا۔ فوراً معاملے کو سمجھ گئی۔ چپ چاپ اُٹھی اور کپڑا نکال کر اُس کی اُنگلی پر باندھ دیا اور کہا۔ "قاسم! اب تم ہمارے گھر میں نہیں رہ سکتے۔"

"وہ کیوں بی بی جی؟"

"یہ صاحب سے دریافت کرنا۔"

صاحب کا نام سنتے ہی قاسم کا رنگ اور بھی سپید ہوگیا۔

چار بجے کے قریب انسپکٹر صاحب دفتر سے گھر آئے اور اپنی بیوی سے قاسم کی نئی حرکت سُن کر اُسے فوراً اپنے پاس بلایا۔

"کیوں میاں یہ اُنگلی کو ہر روز زخمی کرنے کے کیا معنی ہیں؟" قاسم خاموش کھڑا رہا۔

"تم نوکر لوگ یہ سمجھتے ہو کہ ہم لوگ اندھے ہیں اور ہمیں بار بار دھوکہ دیا جاسکتا ہے۔ اپنا بستر بوریہ دبا کر ناک کی سیدھ میں یہاں سے بھاگ جاؤ۔ ہمیں تم جیسے نوکروں کی کوئی ضرورت نہیں— سمجھے۔"

"مگر— مگر صاحب۔"

"صاحب کا بچہ— بھاگ جا یہاں سے، تیری بقایا تنخواہ کا ایک پیسہ بھی نہیں دیا جائے گا— اب میں اور کچھ نہیں سننا چاہتا۔"

قاسم روتا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا۔ طوطے کی طرف حسرت بھری نگاہوں سے دیکھا۔ طوطے نے بھی خاموشی میں اس سے کچھ کہا اور اپنا بسترہ لے کر دو سیڑھیوں سے نیچے اُتر گیا۔ مگر دفعتاً کچھ خیال آیا اور بھاگا ہوا اپنے آقا کی بیوی کے پاس گیا اور دردانگیز آواز میں اتنا کہہ کر "سلام بی بی جی— میں ہمیشہ کے لیے آپ سے رخصت ہورہا ہوں۔" وہاں سے رخصت ہوگیا۔

خیراتی ہسپتال میں ایک نوخیز لڑکا درد کی شدت سے لوہے کے پلنگ پر کروٹیں بدل رہا ہے۔ پاس ہی دو ڈاکٹر بیٹھے ہیں۔

اُن میں سے ایک ڈاکٹر اپنے ساتھی سے مخاطب ہوا— "زخم خطرناک صورت اختیار کرگیا ہے۔ ہاتھ کاٹنا پڑے گا۔"

"بہت بہتر۔"

یہ کہتے ہوئے دوسرے ڈاکٹر نے اپنی نوٹ بک میں اُس مریض کا نام درج کرلیا۔ ایک چوبی تختے پر جو چارپائی کے سرہانے لٹکا ہوا تھا۔ مندرجۂ ذیل الفاظ لکھے تھے۔

نام: محمد قاسم ولد عبدالرحمٰن (مرحوم)

عمر: دس سال۔

(افسانوی مجموعہ "آتش پارے" سے ماخوذ)

قومی اردو کونسل نے نہ صرف حوالہ جاتی بلکہ اعلا درجات کی ضرورتوں کے مطابق درسی کتابیں شائع کی ہیں۔

طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40%کی خصوصی رعایت

تاجران کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جاتا ہے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک۔1، آر۔ کے۔ پورم، ونگ-6، نئی دہلی-110066

سلام بن رزاق

مہابھارت کی روایت اور اردو افسانہ

راماءن اور مہابھارت سنسکرت زبان کے دو عظیم رزمیے ہیں۔ ہندستان کی ہر زبان کے ادب پر ان کتابوں کے اثرات نمایاں طور پر دیکھے جاسکتے ہیں۔ اردو ادب کا دامن بھی اس سے خالی نہیں ہے۔ شاعری کے علاوہ ناول اور افسانے میں بھی اُن عناصر کو تلاش کیا جاسکتا ہے۔ بالخصوص مہابھارت کا پلاٹ، اس کے کردار، اس کے واقعات اس قدر پہلو دار ہیں کہ ہزاروں سال کا عرصہ گزر جانے کے بعد بھی ان کی دلچسپی اور تازہ کاری میں فرق نہیں آیا ہے۔ ہر عہد میں اس کے قصوں اور کرداروں کو نئی نئی جہتیں دی گئی ہیں۔ اس کتاب میں اسرار ومعانی کا ایسا خزانہ پوشیدہ ہے کہ جس سے ہر زبان کے ادیب اور شاعر اپنی اپنی استعداد کے مطابق استفادہ کرتے آئے ہیں۔

مراٹھی، بنگالی، ہندی، کنڑ اور ملیالم زبانوں میں مہابھارت کے پس منظر میں صرف افسانے ہی نہیں بڑے بڑے ناول بھی لکھے گئے ہیں۔ علاقائی زبانوں کے ادب میں ان کا مقام بہت بلند ہے مگر اردو میں مہابھارت کے پس منظر میں فکشن کا کوئی ایسا نمونہ پیش نہیں کیا گیا ہے جسے شاہکار کا درجہ حاصل ہوتا۔ البتہ افسانوں میں ادھر اُدھر مہابھارت کے اجزا بکھرے نظر آتے ہیں۔ کہیں کہیں کسی ایک واقعہ یا کردار کو لے کر پورا افسانہ بھی تخلیق کیا گیا ہے۔

یہاں چند افسانوں کا جائزہ لیا جاتا ہے جن کی اساس مہابھارت کے واقعات یا کرداروں پر رکھی گئی ہے۔ یوں تو کئی افسانہ نگاروں کے افسانوں میں دیومالا یا مہابھارت کے اکا دکا حوالے مل جاتے ہیں تاہم ان میں انتظار حسین اور سریندر پرکاش کے افسانوں میں دیومالائی عناصر اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ تخلیقی پیکروں میں ڈھلتے نظر آتے ہیں۔

سریندر پرکاش جدید افسانے کا ایک اہم نام ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ''کہانی کار بوڑھا ہوجاتا ہے مگر کہانی کبھی بوڑھی نہیں ہوتی۔'' سریندر پرکاش کے پاس بھی چند ایسی کہانیاں ہیں جن کی چمک دمک عرصے تک باقی رہے گی۔ ان کے دو افسانے ''پیاسا سمندر'' اور ''گاڑی بھر رسد'' مہابھارت کے واقعاتی پس منظر میں بیان کیے گئے ہیں۔ 'گاڑی بھر رسد' میں مہابھارت کے 'بکاسُر' والے واقعے کو آج کے تناظر میں اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ پورا افسانہ جبرو استبداد اور مظلومیت کا استعارہ بن جاتا ہے۔

مہابھارت میں بکاسُر راکشس کی بھوک مٹانے کے لیے بستی والے روزانہ گاڑی بھر اناج اور ایک زندہ آدمی بھیجا کرتے تھے۔ ہزاروں برس گزر جانے کے بعد بھی یہ رسم جاری ہے اور بستی والے اب پہاڑ کے اُس طرف رہنے والے جن یا راکشس کے لیے گاڑی بھر اناج اور ایک زندہ آدمی بھیجنے پر مجبور ہیں۔ گویا جگہ بدل جائے، حکومت بدل جائے، زمانہ بدل جائے مگر بکاسر کی بھوک ختم نہیں ہوتی۔ اور یہ کہ مذہب اور سیاست کے نام پر ایک عام آدمی کا ہر عہد میں استحصال کیا گیا ہے۔ کہانی کی خوبی یہ ہے کہ پوری کہانی میں کہیں بکاسر کا ذکر نہیں ہے مگر شروع سے آخر تک بکاسر کی دہشت کسی مہیب سایے کی طرح کہانی پر چھائی رہتی ہے۔ کہانی میں کہیں مہابھارت کا حوالہ نہیں ہے مگر کہانی کا تانا بانا کچھ اس طرح بنا گیا ہے کہ قاری اپنے آپ کو مہابھارت کال میں سانس لیتا محسوس کرتا ہے۔ اور جب پروہت کہتا ہے کہ

> ''ہزاروں برس پہلے اس کے ساتھ یہ طے ہوگیا تھا کہ وہ ہمارے گاؤں پر کوئی آفت نہیں ڈھائے گا بلکہ قدرت اور انسانوں کے قہر سے ہماری حفاظت کرے گا۔ یہ معاہدہ ہمارے لیے ایک متبرک رسم کی صورت اختیار کرگیا ہے۔''

تب اچانک محسوس ہونے لگتا ہے کہ یہ تو مہابھارت کی نہیں ہمارے اپنے عہد، اپنی بستی اور اپنے آس پاس کی کہانی ہے، جہاں حکومت کا جبر اور مذہب کا قہر آج بھی بکاسر کی طرح اس کی جان کا خراج وصول کررہا ہے۔

بکاسر کے استعارے کو ایک اور افسانہ نگار شرون کمار نے اپنے افسانے 'کچھ نہیں ہوگا' میں ایک دوسرے انداز سے برتا ہے۔ بتایا گیا ہے کہ بھیم بکاسر کا وَدھ کرنے کے بعد اُس کی لاش کو جنگل میں چھوڑ کر چلا گیا۔ پانچ ہزار برس بعد لاش میں حرکت ہونے لگتی ہے، لوگ خوف زدہ ہوجاتے ہیں۔ حکومت حرکت میں آتی ہے مگر اچانک لاش غائب ہوجاتی ہے اور پھر بکاسر کبھی کسی آفیسر کی کُرسی پر نظر آتا ہے' تو کبھی منسٹر کے آسن پر۔ اس طرح بکاسر بدعنوان اور رشوت خور سرکاری افسروں اور منسٹروں کی نمائندگی کرتا نظر آتا ہے۔ گویا رشوت خور سرکاری ملازم ایسے بکاسر ہیں جن کی طلب بکاسر راکشس کی بھوک کی طرح کبھی ختم نہیں ہوتی۔ بدعنوانی کے خلاف 'کچھ نہیں ہوگا' ایک موثر استعاراتی کہانی ہے۔ یہاں سریندر پرکاش کی ایک اور کہانی 'پیاسا سمندر' کا ذکر بھی بے محل نہ ہوگا۔ یہ محبت اور شہوت کی کش مکش کی کہانی ہے۔

پربھاکر پنڈت ایک پیشہ ور کتھا واچک ہیں۔ وہ راماءن کی کتھا پڑھتے ہیں مگر اپنے آپ کو 'رادھے بھگت' کہتے ہیں۔ وہ 'شبھ' نام کی ایک شادی شدہ عورت سے محبت کرتے ہیں جس کے دو بچے ہیں۔ وہ عورت بھی اُن پر دل و

جان سے فریفتہ ہے مگر پنڈت جی اُس سے جسمانی رشتہ قائم کرنے کی ہمت نہیں جٹا پاتے۔ مگر جب اُن پر جنس کا غلبہ طاری ہوتا ہے تو تنہائی میں شبھ کی تصویر کے سامنے ننگ دھڑنگ ہو کر غالباً خیالوں میں اُس سے جنسی تلذّذ حاصل کرتے ہیں۔ اس دوران ایک دوسری عورت جس کا نام کنتی ہے، پنڈت جی پر عاشق ہوجاتی ہے اور اُن سے جسمانی رشتہ قائم کرنے کے لیے اصرار کرتی ہے۔ پنڈت جی منع کرتے ہیں۔ جب عورت زبردستی کرتی ہے تو پنڈت جی کھڑکی سے کود کر اپنی جان دے دیتے ہیں کیونکہ وہ شبھ سے بے وفائی نہیں کر سکتے تھے۔

بظاہر کہانی کا پلاٹ سیدھا سادہ نظر آتا ہے مگر پنڈت جی کا ایک جملہ جو وہ خط میں اپنی محبوبہ شبھ کو لکھتے ہیں، کہانی کو مہابھارت کے کرداروں کے روبرو لاکر کھڑا کردیتا ہے۔ پنڈت جی لکھتے ہیں۔ ''منشیہ اپنی مرتیو اپنے ساتھ لے کر پیدا ہوتا ہے۔ دُریودھن اگر اپنی ماتا گندھاری کے سامنے لنگوٹ پہن کر نہ جاتا تو کبھی نہ مرتا۔'' یہ جملہ کہانی کے رمز کو کھولنے میں کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ ''گندھاری اپنے اندھے شوہر دھرت راشٹر کی محبت میں خود بھی آنکھوں پر پٹی باندھے رہتی تھی۔ اس 'پتی پریم' کے سبب اُس کی آنکھوں میں ایک تجلّی پیدا ہوگئی تھی۔ وہ اپنے بیٹے دریودھن سے کہتی ہے۔
''تم بےلباس ہوکر میرے پاس آؤ، میں اپنی نظر کی شکتی سے تمھارے جسم کو امر کردوں گی۔ میری نظر تمھارے جسم کے جس حصے پر پڑے گی اُس پر دنیا کا کوئی ہتھیار اثر نہیں کر سکے گا۔''

دریودھن ماں کے سامنے ننگا ہوکر آتا ہے مگر عین وقت پر مارے شرم کے ایک لنگوٹ سے اپنا ستر چھپاتا ہے۔ گندھاری اپنی آنکھوں سے پٹی کھولتی ہے اور دریودھن پر نظر ڈالتی ہے۔ لنگوٹ والے حصے کو چھوڑ کر اُس کے جسم کا باقی حصہ امر ہوجاتا ہے۔ گندھاری ناراض ہوتی ہے مگر جو ہونا تھا ہو چکا۔ یہ بات صرف کرشن کو معلوم ہے۔ میدانِ جنگ میں دریودھن پر کوئی ہتھیار کارگر نہیں ہوتا تب کرشن بھیم کو اشارہ کرتے ہیں کہ اُس کی ران پر وار کرو۔ بھیم گرز سے ران پر وار کرکے اُس کی ٹانگ توڑ دیتا ہے۔ اس طرح دریودھن کی موت واقع ہوتی ہے۔ گویا دریودھن کا اپنی ماتا گندھاری کے سامنے لنگوٹ پہن کر جانا ہی اُس کی موت کا سبب بنا۔ یعنی اُس کی لاج ہی اُس کی موت کی وجہ بن جاتی ہے۔ پربھاکر پنڈت بھی دوسری عورت کنتی کو لاج کے مارے اپنے قریب آنے سے منع کرتے ہیں مگر وہ شہوت میں ایسی اندھی ہوگئی ہے کہ اُن کی ایک نہیں سنتی اور پنڈت جی کھڑکی سے کود کر جان دے دیتے ہیں۔

دوسری عورت کا نام کنتی ہے۔ یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ کنتی پانڈوؤں کی ماں تھی مگر مہابھارت کی روایت کے مطابق جب وہ بالغ ہوئی تو سورج دیوتا اُس پر عاشق ہوگئے اور وہ گربھ وتی ہوگئی۔ اس طرح کرن پیدا ہوا، جو اُس کی ناجائز اولاد تھی۔ غالباً افسانے کی کنتی بھی پربھاکر پنڈت سے کچھ ایسا ہی مطالبہ کررہی ہے کہ وہ سورج دیوتا بن کر ایک بار پھر اُس کی کوکھ ہری کردے۔

اس طرح صرف ایک جملے اور ایک نام کی وجہ سے پورے افسانے کو مہابھارت کا تناظر حاصل ہوجاتا ہے اور افسانہ معمولی سطح سے اُٹھ کر استعاراتی فضا میں سانس لینے لگتا ہے۔

جوگیندر پال نے بھی اپنی کہانیوں میں دیو مالا کا کافی استعمال کیا ہے۔ اُن کی ایک کہانی ہے 'مہابھارت کی دوسری جنگ' جس میں 'دروپدی' نام کی ایک بیوہ اور بے سہارا عورت چوری چھپے جسم فروشی کا دھندا کرتی ہے۔ محلے والوں کو اُس کے دھندے کے بارے میں پتا چل جاتا ہے۔ وہ اُسے ذلیل کرتے ہیں۔ تب وہ کہتی ہے۔

''ساری دنیا کوروؤں کی طرح میرا وستر ہرن کرنا چاہتی ہے۔ یعنی مجھے بے آبرو کرنا چاہتی ہے، مگر کوئی آگے بڑھ کر میرا ہاتھ پکڑنے کو تیار نہیں، مہابھارت کی دروپدی کے تو پانچ پتی تھے، اور خود کرشن بھگوان بھی اُس کے مددگار تھے مگر میں تو اکیلی ہوں۔ مہابھارت کی یہ دوسری جنگ میں اکیلی بھلا کیسے لڑسکتی ہوں۔'' یہاں ایک نکتہ قابلِ غور ہے کہ ایک آبرو باختہ عورت بھی سماج کی نگاہوں میں بے آبرو ہونا نہیں چاہتی۔ غالباً اُس کی یہی 'حیاداری' قاری کی نگاہوں میں اُسے ذلیل ہونے سے بچالیتی ہے۔ افسانے کی دروپدی ہمارے آس پاس کی ایسی ہی بے یارومددگار عورتوں کا نمائندہ کردار بن جاتی ہے جو حالات سے مجبور ہوکر جسم فروشی کا پیشہ اختیار کرتی ہیں۔ دروپدی کے نام کی وجہ سے کہانی کو ایک نئی جہت مل جاتی ہے۔

کنور سین کے افسانے 'گلیڈ یئز' اور 'دھرت راشٹر کے بعد' میں بھی مہابھارت کے اجزا پائے جاتے ہیں مگر اُن کے اسلوب نگارش پر تجریدیت کا ایسا غلبہ ہے کہ مہابھارت کے حوالوں کے باوجود کہانیاں پیچیدہ اور غیر دلچسپ ہوگئی ہیں۔ 'دھرت راشٹر کے بعد' افسانے میں غالباً انھوں نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ اقتدار کی ہوس انسان کو اندھا کردیتی ہے اور وہ اپنے راج پاٹ کو بچانے کی خاطر ظلم و تشدد کو بھی روا رکھتا ہے۔

70 کے بعد کے افسانہ نگاروں نے بھی اپنے افسانوں میں کہیں کہیں ہندو دیو مالا کا استعمال کیا ہے۔ 'حسین الحق' کی کہانی 'آتم کتھا' اور قمراحسن کی کہانی 'کل یگ کی علامت' پر مہابھارت کی روایت کی چھاپ واضح طور پر دیکھی جاسکتی ہے۔ اس لیے کہانی زمین سے جڑنے کی بجائے فضا میں تیرتی نظر آتی ہے۔ کہانی میں بتایا گیا ہے کہ راوی بھاگ رہا ہے اور کُتّے اُس کا

تعاقب کررہے ہیں۔ وہ بھاگتے ہوئے کروکشیتر میں پہنچتا ہے جہاں مہابھارت کی جنگ شروع ہونے جارہی ہے۔ مگر وہ دیکھتا ہے کہ دونوں طرف بے سر کے انسانوں کی فوج ایک دوسرے کے مقابل کھڑی ہے۔ جب وہ نارد جی کی دی ہوئی عینک لگا کر دیکھتا ہے تو دنگ رہ جاتا ہے کہ اب وہاں انسانوں کی بجائے دونوں طرف کتے نظر آتے ہیں۔ آخر میں وہ اس آپادھاپی سے نجات پانے کے لیے جیب سے چھری نکال کر خود اپنا سر دھڑ سے جدا کر دیتا ہے اور خود بھی بے سر کے انسانوں میں شامل ہوکر بھیڑ کا ایک حصہ بن جاتا ہے۔ اگر اس کہانی کی گرہیں کھولیں تو مفہوم کچھ اس طرح نکل سکتا ہے کہ آج کے معاشرے میں اکثر انسان ایسے ہیں جن کا کوئی کردار نہیں، اس لیے اکثریت بے سر کے انسانوں کی ہے۔ کتے انسان کے اندر چھپی ہوئی خباثت، درندگی اور جھوٹ کا استعارہ ہوسکتے ہیں۔ کروکشیتر انسان کی ازلی ستیزہ کاری کا استعارہ ہوسکتا ہے جہاں شب و روز نئی مہابھارت چھڑی رہتی ہے اور دونوں طرف بے سر کے انسان ایک دوسرے سے آمادۂ پیکار نظر آتے ہیں۔ آخر میں راوی بھی اپنا سر قلم کرکے بے سر کے لوگوں میں شامل ہوجانے میں ہی اپنی عافیت سمجھتا ہے اس طرح یہ کہانی ہر عام آدمی کی 'آتم کتھا' بن جاتی ہے۔ 'آتم کتھا' میں مہابھارت کی جنگ کا حوالہ کہانی کو ایک دیومالائی رُخ عطا کرنے کے ساتھ انسان کے اندر چھپی بربریت اور اُس کی بے چہرگی کا اشاریہ بھی بن جاتا ہے۔

ایک اور افسانہ نگار 'قمر احسن' کے یہاں بھی ماضی کی بازیافت ایک غالب رجحان کی شکل میں نظر آتی ہے۔ یہاں اُن کی صرف ایک کہانی 'کل یگ کی علامت' کو لیا جاتا ہے۔ کہانی کی فضا براہِ راست مہابھارت کال ہی سے ماخوذ ہے۔ مگر کہانی میں جو علامتیں اور استعارے بیان ہوئے ہیں، آج کے معاشرے پر بھی اُن کی بآسانی تطبیق کی جاسکتی ہے۔ جوے میں ہارنے کے بعد پانڈوؤں کو بارہ برس کے لیے بن باس اختیار کرنا پڑا۔ ایک دن وہ بھٹکتے بھٹکتے ایک سادھو سے ملتے ہیں۔ سادھو کہتا ہے" آنے والا زمانہ کل یگ کا ہوگا۔ اپنے سفر کے دوران تمھیں جو سب سے عجیب بات نظر آئے، اُسے غور سے دیکھو اور اُس کا مطلب جاننے کی کوشش کرو۔ وہی کل یگ کی علامت ہوگی۔ سفر میں اُنھیں سچ مچ عجیب و غریب باتیں نظر آتی ہیں مثلاً یدھشٹر کو ایک ہاتھی نما جانور دکھائی دیتا ہے جس کے آگے پیچھے سونڈ تھی، جو ایک طرف سے پانی پیتا ہے اور دوسرے طرف سے پانی نکالتا جارہا ہے۔ بھیم، ارجن، سہدیو اور نکل بھی ایسی ہی عجیب و غریب باتیں دیکھتے ہیں۔ پانچوں کی باتیں سننے کے بعد سادھو کہتا ہے۔ "یہ سب کل یگ کی علامتیں ہیں۔ ان کا مطلب میں کل صبح تمھیں بتاؤں گا۔ اور کہانی ختم ہوجاتی ہے۔ اس طرح افسانہ نگار نے ان علامتوں کے مفہوم کو سمجھنے کا کام قاری کی استعداد پر چھوڑ دیا ہے۔

کہانی پر قصے پن کا روایتی انداز پوری طرح حاوی ہے اور کہانی پڑھتے ہوئے ایسا لگتا ہے کہ ہم کوئی پورانک کہانی یا کسی داستان کا کوئی دلچسپ اور محیر العقول باب پڑھ رہے ہیں۔ ذرا سا غور کریں تو پتا چلتا ہے کہ افسانہ نگار نے ہندو دیومالا اور اسلامی حکایتوں سے افسانے کا ملغوبہ تیار کیا ہے۔ مثال کے طور پر کل یگ کی جو علامتیں بیان کی گئی ہیں۔ اسلامی کتابوں میں قربِ قیامت کی علامتیں ان سے ملتی جلتی ہیں۔ مثلاً قربِ قیامت کی ایک علامت میں بتایا گیا ہے کہ ایک بڑا پرندہ نظر آئے گا جس کے پروں پر قرآن کریم کی آیتیں لکھی ہوں گی مگر وہ گندگی کھا رہا ہوگا۔ اس کا مفہوم یہ بتایا گیا ہے کہ قربِ قیامت کے زمانے میں عالم بدگوئی کا شکار ہوں گے۔ کل یگ کی علامت میں ارجن بھی ایک ایسا ہی پرندہ دیکھتا ہے جس کے جسم پر دیوتاؤں کے نام لکھے ہیں مگر اُس کی چونچ میں مردہ اِنسانوں کی کھوپڑی ہے۔

افسانہ نگار نے اس کہانی کے ذریعے یہ تاثر دینے کی کوشش بھی کی ہے کہ زبانیں اور علاقے الگ ہوسکتے ہیں مگر کہانی کا منبع و مخرج ایک ہی ہوتا ہے۔ انسان کا اجتماعی شعور — اسلامی حکایتوں اور دیومالائی داستانوں کے امتزاج سے اردو افسانے کو ایک نئی جہت عطا کرنے والوں میں انتظار حسین کا نام سرِ فہرست ہے۔ اس ضمن میں اُن کی کئی کہانیوں کے حوالے دیے جاسکتے ہیں مگر یہاں اُن کے تازہ ترین افسانے 'مورنامہ' کا مختصر سا تجزیہ پیش کیا جاتا ہے جس میں حال ہی میں ہونے والے ایٹمی دھماکے اور اُن کی تباہ کاری کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ کہانی کی جڑوں کو مہابھارت کی زمین میں دریافت کرکے افسانہ نگار نے کہانی کو مزید دلچسپ اور فکر انگیز بنا دیا ہے۔ افسانے کا محرک ایک چھوٹی سی خبر بنتی ہے کہ جب ایٹمی دھماکہ ہوا تو راجستھان کے مور سراسیمگی کے عالم میں جھنکارتے، شور مچاتے اپنے گوشوں سے نکلے اور حواس باختہ فضا میں تتر بتر ہوگئے۔ اسلامی روایت کے مطابق مور جنت کا جانور ہے اور ہندو دیومالا کے مطابق وہ دیوتاؤں کی سواری ہے۔ وہ نہ صرف فطرت کے حسن کے بقا کی علامت ہے بلکہ مسرت و انبساط اور پاکیزگی کا بھی استعارہ ہے۔

ایٹمی دھماکے سے موروں کے غائب ہوجانے کے بعد راوی موروں کی تلاش میں نکلتا ہے تب اُسے 'مہابھارت' کی جنگ کا سب سے ملعون اور منحوس کردار اشوتھاما دکھائی دیتا ہے۔ اشوتھاما، درونا چاریہ کا بیٹا تھا اور مہابھارت کی جنگ میں کوروؤں کے ساتھ تھا۔ درونا چاریہ کو دیوتاؤں سے 'برہم استر' کا وردان ملا تھا۔ 'برہم استر' ایسا ہتھیار تھا

جس کے استعمال سے دنیا کے تمام 'جیو جنتو' فنا ہو سکتے تھے۔ درونا چاریہ نے 'برہم استر' کا راز صرف اپنے چہیتے شاگرد ارجن کو بتایا تھا۔ جنگ میں استاد اور شاگرد ایک دوسرے کے مقابل آکر کھڑے ہو جاتے ہیں مگر دونوں 'برہم استر' کے استعمال سے گریز کرتے ہیں۔ مرتے وقت درونا چاریہ 'برہم استر' کا راز اپنے بیٹے اشوتھاما کو بتا دیتے ہیں۔

جنگ کے بالکل آخر میں جب پانڈووں کی جیت قریب تھی، اشوتھاما برہم استر چلا دیتا ہے۔ جس کی مار سے پانڈووں کی استریوں کا حمل گر جاتا ہے۔ تب کرشن ناراض ہو کر اُسے شراپ دیتے ہیں۔ ''درونا کے پاپی پتر تو نے بالک ہتیا کا پاپ کیا ہے اس لیے میں تجھے شراپ دیتا ہوں، تو ہزاروں برس تک اس طرح جیے گا کہ تیرے زخموں سے سدا خون اور پیپ رسا کرے گی اور بستی والے تجھ سے گھن کھائیں گے۔''

روایت ہے کہ اشوتھاما، آج بھی زندہ ہے اور اپنے سڑے گلے بدن کے ساتھ بنوں میں بھٹک رہا ہے۔ انتظار حسین نے اس روایت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے کہانی میں یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ دراصل 'ایٹم بم' موجودہ عہد کا برہم استر ہے۔ اُسے استعمال کرنے والا اشوتھاما کی طرح انسانی نسل کا قاتل ٹھہرے گا۔ اشوتھاما کو قابلِ نفریں گردانتے ہوئے افسانہ نگار نے، ایٹمی طاقت کا مظاہرہ کرنے والوں سے بھی نفرت کا اظہار کیا ہے اور انھیں آگاہ کیا ہے کہ اس برہم استر کے استعمال سے گریز کرو ورنہ انسانی نسل کی تباہی و بربادی تمھارے سر ہوگی۔

افسانہ نگار نے ایک جگہ بڑے پتے کی بات کہی ہے۔ ''جنگ کے آخری لمحوں سے ڈرنا چاہیے۔ جنگ کے سب سے نازک اور خوفناک لمحے وہی ہوتے ہیں۔ جیتنے والے کو جنگ کو نبٹانے کی جلدی ہوتی ہے۔ ہارنے والا جی جان سے بیزار ہوتا ہے تو وہ خوفناک ہتھیار جو بس ڈرانے دھمکانے کے لیے ہوتے ہیں، آخری لمحوں میں استعمال ہوتے ہیں۔ پھر بے شک شہر جل کر 'ہیروشیما' بن جائے، دل کی حسرت تو نکل جاتی ہے۔''

'مورنامہ' دراصل ایٹمی دھماکوں کے زہریلے اثرات اور ایٹمی جنگ کے ہولناک نتائج کے خلاف ایک افسانہ نگار کا درد بھرا احتجاج ہے، اور ہندستان اور پاکستان دونوں ملکوں کے اہلِ اقتدار کے لیے ایک عبرت انگیز اشارہ بھی ہے۔

دیومالا یا اساطیر سے مجھے بھی دلچسپی ہے اور ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے میں نے بھی حتی المقدور ان سے استفادہ کیا ہے۔ مہابھارت کے حوالے سے یہاں میں اپنے صرف ایک افسانے 'اِکلویہ' کا ذکر کرنا چاہوں گا۔

'اِکلویہ' مہابھارت کا وہ بدنصیب کردار ہے جسے درونا چاریہ نے تیر اندازی کا فن سکھانے سے اس لیے منع کر دیا تھا کہ وہ 'شودر' تھا۔ کہانی میں بتایا گیا ہے کہ ہزاروں برس بعد 'اِکلویہ' دوبارہ جنم لیتا ہے مگر اب کے وہ 'شودر' نہیں ہے۔ ایک معمولی مزدور کا لڑکا ہے، وہ بارھویں میں ٹاپ کرنے کے بعد جب میڈیکل سائنس میں داخلہ لینے کے لیے کالج جاتا ہے تو وہاں پرنسپل کی کرسی پر درونا چاریہ براجمان ہیں۔ درونا چاریہ اُسے اس بار بھی مایوس لوٹا دیتے ہیں اور کہتے ہیں۔

''' اِکلویہ تو بڑا ابھاگا ہے۔ زمانہ بدل چکا ہے۔ جب تجھے ہریجن کے گھر میں جنم لینا تھا تو پیدا ہوا غیر ہریجن کے گھر میں، اگر تو آج بھی شودر یا ہریجن ہوتا تو میں آنکھیں بند کر کے تجھے ایس سی کوٹے سے سیٹ دے دیتا۔''

اس افسانے میں کوٹا سسٹم کی ناقص پالیسی کی جانب اشارہ کیا گیا ہے۔ بیشک پچھڑی ذاتوں کو فائدہ ملے مگر ذہین اور مستحق طلبہ کے ساتھ بھی ناانصافی نہیں ہونا چاہیے۔

بلاشبہ 'مہابھارت' ہمارے ملک کا بہت بڑا رزمیہ ہے۔ اس میں زندگی کے اسرار و رموز کا ایک جہاں آباد ہے۔ اگر ہمارے ادیبوں نے اس جانب خاطر خواہ توجہ دی تو دیگر زبانوں کی طرح اردو میں بھی مہابھارت کی اساس پر فکشن کے اعلا نمونے پیش کیے جا سکتے ہیں۔

603-B, New Aakar Co-op Hsg. Society,
Naya Nagar, Near Hydery Society,
Mira Road, (E) Dist: Thane-401107

□□□

جوابات کوئز:

1-ب	2-ج	3-الف	4-الف	5-الف	6-الف
7-الف	8-د	9-الف	10-الف	11-الف	12-الف
13-الف	14-الف	15-الف	16-الف	17-ج	18-الف
19-الف	20-ب	21-الف	22-ج	23-الف	24-الف
25-الف	26-ب	27-ب	28-ب	29-ب	30-الف
31-ب	32-الف	33-الف	34-الف	35-الف	36-الف
37-ب	38-الف	39-ب	40-الف	41-ب	42-الف
43-ب	44-الف	45-الف	46-الف	47-ب	48-ب
49-ب	50-الف	51-ب	52-ج	53-الف	54-الف
55-ب					

مشرف علی

جیلانی بانو سے گفتگو

سوال: آپ کے نزدیک ادب کو کس حد تک کسی نظریے کا پابند ہونا چاہیے اور ادیب کو کس حد تک آزادی ہونی چاہیے؟

جواب: نظریے سے آپ کی کیا مراد ہے؟ ہر ادیب پر ایک ذمے داری عائد ہوتی ہے۔ اپنے قلم سے دنیا کو بہتر بنانا۔ ادیب لیڈر کی طرح عوام کے آگے کھڑے ہوکر نعرے بازی نہیں کرتا، نہ وہ دنگے فساد کرنے والوں کے بیچ شاعری اور افسانے سناتا ہے۔ مگر ادب بدلتے ہوئے وقت کی آہٹ کی خبر دیتا ہے۔ کیونکہ مذہب، آرٹ اور ادب یہ سب الگ الگ راستوں سے انسان کو سمجھنے کی جستجو ہے۔ ادب انسان کو سچائی، امن اور روشنی کی طرف لے جاتا ہے اور یہی ایک ادیب کا فرض ہے جو اسے ادا کرنا ہے۔ اب یہ تو ہر ادیب کا انفرادی فعل ہے کہ وہ زندگی کو کس زاویے سے دیکھتا ہے، آگے جانے کے لیے کون سا راستہ اختیار کرتا ہے۔ اس لیے میں تو کسی مخصوص ادبی نظریے کو ہر لکھنے والے پر عائد کرنے کی تائید نہیں کرتی۔ اور پھر ہمارا نقطۂ نظر وقت کے ساتھ زندگی کے تجربوں کے ساتھ بدلتا رہتا ہے اور جہاں تک میں سمجھتی ہوں کسی بھی لکھنے والے پر ایسی کوئی پابندی نہیں لگائی گئی ہے کہ وہ کیا سوچے، کیا لکھے یا سیاسی شعبدہ بازوں کی طرح کس ادبی گروپ میں شامل ہو۔ ہر لکھنے والے کو یہ راستہ تو خود ہی ڈھونڈنا پڑتا ہے۔

سوال: جس زمانے میں آپ نے ادبی سفر کا آغاز کیا، اس وقت ترقی پسند تحریک کا زور کم ہورہا تھا اور غالب رجحان جدیدیت کا تھا جس نے افسانے کے روایتی فارم سے انحراف کیا اور اس عہد کے تقریباً تمام افسانہ نگاروں کو متاثرکیا۔ اس کے متعلق آپ کے کیا خیالات رہے ہیں؟

جواب: جب میں نے لکھنا شروع کیا، میں ادب کی کسی تحریک سے واقف نہیں تھی۔ میں گھر سے باہر نہیں نکلتی تھی۔ ادیبوں اور ادبی سرگرمیوں کی بھی کچھ خبر نہیں تھی۔ ترقی پسند ادب کیا ہے اور اب ادب میں کون سے نئے رجحان آرہے ہیں، مجھے اس کا بھی کوئی اندازہ نہیں تھا۔

قرۃ العین حیدر، بیدی، کرشن چندر، عزیز احمد، اے۔ حمید، حجاب امتیاز

● جیلانی بانو اردو فکشن میں ایک اہم مقام کی مالک ہیں۔ انہوں نے اپنی تخلیقات کے ذریعے سماج کے گوناگوں مسائل خصوصاً سرزمینِ حیدرآباد کی معاشرتی وسیاسی فضا اور تہذیبی و ثقافتی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ عصری زندگی کا گہرا شعور رکھتی ہیں اور بڑی معروضیت کے ساتھ اپنے احساسات و مشاہدات کو اپنی تخلیقات میں پیش کرتی ہیں۔ ان کے ناول "ایوان غزل"، "بارشِ سنگ" اور افسانوی مجموعے "نروان"، "پرایا گھر"، "سچ کے سوا"، "بات پھولوں کی" اور "یہ کون ہنسا" وغیرہ شائع ہوچکے ہیں۔

علی، ابنِ انشا وغیرہ کا اسٹائل پسند تھا۔ ان کی تحریریں شوق سے پڑھتی تھی۔ ترقی پسند ادب کی روایت سے انحراف کن افسانہ نگاروں نے اور شاعروں نے کیا تھا اور اپنی کن کہانیوں، نظموں کے ساتھ وہ جدید لکھنے والوں سے جا ملے تھے؟
ترقی پسند ادب کی بنیادی شرط تھی، انسان دوستی، مذہبی اور لسانی تعصب سے دوری، محنت کش طبقے کے معاشی استحصال اور سیاسی جبر کی مخالفت، میں نہیں جانتی کہ جدید ادب کے نقادوں نے جدید افسانے میں ان تمام عناصر کو غیر ضروری سمجھا ہو۔ میں اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی۔ بس میں نے تو یہی سوچا تھا کہ میں کسی کی بات نہیں سنوں گی۔ وہ لکھوں گی جو سب سے الگ ہو۔ اس کا اندازہ آپ کو میرے ابتدائی افسانوں سے ہوسکتا ہے۔ اور شاید یہی وجہ تھی کہ کرشن چندر، احمد ندیم قاسمی، قرۃ العین حیدر، فیض، عصمت چغتائی، ناصر کاظمی، سبطِ حسن، میرزا ادیب اور اس وقت کے اہم ادیبوں نے میری کہانیاں پسند کی تھیں۔

عصمت آپا ہمارے بہت قریب رہیں۔ وہ مجھے اور انور کو بہت چاہتی تھیں، بار بار حیدرآباد آتیں۔ ہمارے گھر بہت خوشی سے رہتیں۔ مذہب، ادب اور پرانے ادیبوں کے بارے میں رات بھر باتیں ہوتی تھیں۔ ان کی تعریف کا انداز بھی نیا سا تھا، 'ایوانِ غزل' پڑھ کر مجھے خط لکھا۔

''اب 'ایوانِ غزل' لکھ کر اتنا مت اتراؤ کہ میرے خط کا جواب ہضم کر گئیں۔''

فیض ترقی پسند شاعر تھے مگر سماجی اور سیاسی مضامین کو انھوں نے فنکاری سے برتا ہے۔ اسے ہم آج کی مابعد جدید شاعری کہہ سکتے ہیں۔ جب فیض صاحب ہمارے گھر آئے تھے تو میں نے ان سے پوچھا تھا۔

''ترقی پسند نقاد کہتے ہیں کہ زندگی کے مسائل پر صاف بچی بات لکھو۔ آپ کیا کہتے ہیں؟

وہ حسب عادت بہت دھیمے لہجے میں بولے۔

''ادب کی دنیا میں اپنی صلیب اپنے کاندھے پر رکھ کر چلنا ہے۔ آپ ادھر ادھر کیوں دیکھتی ہیں؟''

سوال: ریاست حیدرآباد کی ثقافتی و تہذیبی زندگی کے نشیب و فراز نے "ایوانِ غزل" کی تشکیل میں کس طرح حصہ لیا ہے؟

جواب: حیدرآباد کے سیاسی اور تہذیبی ماحول میں بڑا انتشار تھا، مایوسی بھی تھی اور تلنگانہ تحریک کے بعد ادب میں بڑی گرما گرمی تھی۔ میری آپا بچپن گاؤں کی کہانیاں سناتی تھی۔ اماں اور دوسری خواتین جاگیرداروں اور ان کی بیگموں کی کہانیاں سناتیں۔ پھر میں خود حیدرآباد کی بوڑھی خواتین اور اہم شخصیتوں سے ملی۔ مخدوم، راج بہادر گوڑ اور بہت سے پارٹی ورکرز اور ان ادیبوں کے انٹرویو لیے جو تلنگانہ موومنٹ میں شریک تھے اور انھوں نے حیدرآباد کی اس سیاسی اور تہذیبی کشمکش کو دیکھا تھا۔ مجھے اس ناول کے لیے ریسرچ کرنی پڑی تھی۔ پھر میں نے توبہ کرلی کہ اب کوئی اور ناول نہیں لکھوں گی۔

''ایوانِ غزل'' پر مجھے سب سے پہلے ڈاکٹر محمد حسن کی رائے ملی تھی۔ انھوں نے اپنے خط میں لکھا تھا:

''اردو ادب جس ناول کا انتظار کررہا تھا، وہ ہمیں مل گیا۔''

سوال: "تلنگانہ کسان تحریک" کا پس منظر آپ کے افسانوں اور ناولوں میں جابجا موجود ہے۔ آپ کا ناول "بارشِ سنگ" اسی تحریک کے پس منظر میں لکھا گیا ہے۔ اس تحریک کو آپ نے کس طرح Perceive کیا ہے؟

جواب: میرے گھر میں کام کرنے والی اموّلی کا شوہر وقار آباد کے ایک گاؤں میں ریڈی کے یہاں بندھوا مزدور تھا۔ اس کے خاندان کے سب مرد کسی نہ کسی ریڈی کے پاس رہن تھے۔ ''بارشِ سنگ'' کے بہت سے کردار فرضی نہیں ہیں۔ میں ان سے ملنے، ان کی زندگی دیکھنے کے لیے گاؤں میں جا کر رہی ہوں۔ جب یہ ناول لکھ رہی تھی تو بار بار سوچتی تھی کہ میں ان بے شمار انسانوں سے کتنی دور ہوں جو اپنی اور اپنی آنے والی نسلوں کے ہاتھ پیر بھی رہن رکھ چکے ہیں۔ وہ سب جو آج بھی جمہوریت اور سیکولرازم کا ڈھنڈورا پیٹنے والی حکومتوں میں اسی طرح خریدے اور بیچے جارہے ہیں۔ ان کی لڑکیوں کا آکشن (نیلامی) ہورہا ہے۔

آج بھی میرا جی چاہتا ہے کہ میں کسی گاؤں میں جاکر وہاں کی دنیا دیکھوں، ان لوگوں تک پہنچوں، جنھیں پریم چند کے بعد اردو ادیب بھول گئے ہیں۔

سوال: آپ کے ناولوں اور افسانوں میں عورت مرکزی کردار کی حیثیت سے ابھرتی ہے۔ آپ کے یہاں ایک طرف عورت اگر مظلوم ہے تو دوسری طرف سماج کے فرسودہ رسم و رواج سے بغاوت بھی کرتی ہے۔ آپ کے افسانوں میں عورتوں کے حوالے سے ایک اور قابلِ ذکر پہلو یہ ہے کہ تعلیم یافتہ اور اپنے حقوق کے تئیں بیدار عورتوں کی بہ نسبت کم تعلیم یافتہ اور جاہل عورتیں زیادہ فعال نظر آتی ہیں اور اپنے اوپر ہونے والے جبر وظلم کے خلاف بغاوت کرتی ہیں۔ ایسا کیوں ہے؟

جواب: میرے ناولوں، افسانوں کا مرکزی کردار عورت نہیں ہے بلکہ میں نے صرف عورت کے موضوع پر بہت کم لکھا ہے۔ میرا مرکزی کردار انسان کا دکھ ہے۔ ناانصافی، سماجی، مذہبی، سیاسی، اقتصادی دہشت پسندی کا وہ جبر ہے جس کا شکار ہم سب ہورہے ہیں۔ جو کمزور ہے، اسے اور کمزور بنانے کا کھیل ہر طرف ہورہا ہے۔ ایک مرد جو عورت سے جہیز طلب کرتا ہے، اس پر ظلم کرتا ہے تو میں اس مرد کے اوپر اٹھے ہوئے ظلم کے اس ہاتھ کو دیکھتی ہوں

جس نے مرد کو مجبور کر دیا ہے۔

مذہب کے نام پر یقیناً ہر عورت پر ظلم ہو رہا ہے۔ صرف ہندستان ہی میں نہیں، ساری دنیا میں۔ افغانستان میں عورت پر تعلیم کے دروازے بند ہوئے۔ کویت میں عورت ووٹ نہیں دے سکتی۔ ایران میں گا نا نہیں گا سکتی۔ سعودی عرب میں حجاب کے بغیر باہر نہیں نکل سکتی۔ کشمیر میں جینس پہننے والی لڑکیوں کو قتل کر دیا گیا۔ پاکستان (سندھ) میں اپنے خاندان کی لڑکیاں دے کر قاتل آج بھی بری ہو جاتے ہیں۔ مسلمان مرد کسی قصور کے بغیر بھی کسی بھی وقت تین لفظ ادا کر کے عورت کو طلاق دے سکتا ہے لیکن عورت خلع لینا چاہے تو اسے برسوں عدالت کے چکر کاٹنے پڑتے ہیں۔ یہ خود ساختہ، اسلامی تعلیمات سے ناواقف علما ایسے ہی مطالبے مسلمان مرد سے کیوں نہیں کرتے؟ عورت کے ساتھ ایسی ناانصافیوں پر مذہبی عالم چپ کیوں ہو جاتے ہیں؟ شاید میرا احتجاج کہیں آپ کو میری کہانیوں میں بھی نظر آتا ہو۔

سوال: لبرلائزیشن اور گلوبلائزیشن کے اس عہد میں عورتوں میں اپنی حقوق کی تئیں بیداری پیدا ہورہی ہے اور وہ انہیں حاصل کرنے کے لیے جدوجہد بھی کررہی ہیں۔ لیکن موجودہ سماجی وسیاسی نظام میں بحیثیت مجموعی ان کی صورتِ حال آج بھی بہتر نہیں ہے۔ ہر دور میں اردو فکشن نے عورت کی روپ کو کسی نہ کسی طور پر اجاگر کیاہے۔ لیکن موجودہ عہد میں عورتوں کے مسائل پر خال خال افسانے نظر آتے ہیں۔ آپ اس صورتِ حال پر کیا سوچتی ہیں؟

جواب: عورت کے ساتھ انصاف کرنے اور رحم کا برتاؤ کرنے کے اصول ہر مذہب میں ہیں۔ یہ ملک کے قانون میں ہے، دستور میں ہے۔ مگر اس پر عمل کم ہوتا ہے اور ہمارے کسی مذہب کے رہنما، مردوں کو اپنے مذہبی اصولوں پر لے جانے کے لیے کوئی سختی نہیں کرتے۔

اگر اردو فکشن کی بات کی جائے تو افسانے میں اس خاص مقصد کو رکھ کر تو افسانے نہیں لکھے گئے۔ لیکن سماج اور سیاست کی مار سہنے والی عورت کے سب سے زیادہ کردار تقسیم کے بعد والے دور میں تخلیق کیے گئے۔ کالی شلوار، کھول دو، چوتھی کا جوڑا، لاجونتی، گرہن، بن باس—— بے شمار اور بہت اچھی کہانیاں ہندستان اور پاکستان میں لکھی گئیں۔

سوال: موجودہ صارفی عہد میں عورت ایک Commodity(شے) کی صورت اختیار کرتی جارہی ہے۔ اس کے لیے جہاں ایک طرف پدری سماج ذمّے دار ہے وہیں دوسری طرف ایسی عورتیں بھی اس صورتِ حال کی ذمّے دار ہیں جو اپنی مادّی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے کسی بھی حد تک جانے سے گریز نہیں کرتیں۔ بحیثیت ایک سماجی کارکن اور ادیبہ، آپ اس مسئلے کو کس طرح دیکھتی ہیں؟

جواب: ایک بہت بڑے دانشور نے عورت کو دنیا کی سب سے حسین شے کہا ہے اور ساری دنیا کے ادب میں عورت صرف 'حسین شے' ہی رہی ہے۔ وابستگی اور جنسی تسکین کا سامان عورت کے دو ہی روپ تھے۔ ماں اور محبوبہ اور یہ دونوں مرد کی ضرورتیں تھیں۔ شراب، عورت، رات، ساری دنیا کی شاعری کے پسندیدہ موضوع ہیں۔ عورت کا خوبصورت ہونا ضروری ہے۔ شاعری میں کبھی صرف ذہین عورت سے کسی شاعر نے عشق کا اظہار نہیں کیا۔ مرزا ہادی رسوا نے پہلی بار ایک ذہین طوائف کا کردار پیش کیا جو مرد سے جسمانی قرب کی بجائے ذہنی ہم آہنگی کی طلب گار ہے۔ پھر افسانہ زندگی کے ہر پہلو کو سمیٹنے لگا۔ اسلوب اور اظہار کے بہت سے تجربوں سے گزرا۔ مغرب کے ادب کی ہر نئی تکنیک اردو افسانے میں آئی۔ آج چاروں طرف مذہبی، سیاسی اور معاشی دہشت پسندی بڑھتی جارہی ہے۔ مذہب کے نام پر قتل عام ہو رہا ہے۔ ایسے ماحول میں عورت کے کردار کو الگ کر کے مت دیکھیے۔ ناآسودہ خواہشوں کی تکمیل کے لیے آج ہر طرف سودے بازی ہو رہی ہے۔ عورت بھی بکنے اور خریدی جانے والی شے بن رہی ہے۔ جب تک ہماری سوسائٹی میں سماجی ناانصافی رہے گی، عورت بھی بازار میں بکنے اور خریدی جانے والی شے بنی رہے گی۔ آپ ٹی وی کے کسی بھی چینل پر دیکھ سکتے ہیں۔ بکنے والی ہر چیز ایک ننگی عورت ہی آپ کو دکھا رہی ہے۔ عورت کے ساتھ سماج اور مذہب کبھی انصاف کریں گے، مجھے اس کی امید کم ہے۔ ہماری پارلیمنٹ میں عورت کو تحفظات دینے پر ساری پارٹیوں کے ممبر متفق نہیں ہو سکے۔ فسادات میں عورت کے ساتھ جو درندگی ہوتی ہے اس پر ہر زبان کے ادیب، آرٹسٹ چلاتے ہیں لیکن ہوتا کیا ہے۔

آپ ہر دن نیوز پڑھتے ہیں کہ کم جہیز لانے پر لڑکی کا قتل ہو رہا ہے۔ سڑکوں پر چلنے والی عورت، بسوں میں سفر کرنے والی، گھروں میں کام کرنے والی لڑکیوں کی عصمت دری ایک عام بات ہے۔ اور پھر اونچی سطح پر سیاست کے گھناونے کاروبار میں خوبصورت عورت بھی رشوت میں پیش کی جاتی ہے۔ لیکن عملی دنیا میں لڑکیاں، لڑکوں سے آگے بڑھ رہی ہیں۔ وہ ڈاکٹر ہیں، انجینئر ہیں، پائیلٹ ہیں۔ زندگی کے ہر شعبے میں مردوں کے شانہ بشانہ کام کر رہی ہیں۔ اس لیے میں عورت کی جدوجہد سے مایوس نہیں ہوں۔ عورت اپنے قانونی اور مذہبی حقوق کے لیے آج زندگی کے ہر شعبے میں آچکی ہے اور اپنے قانونی، مذہبی حقوق کے لیے لڑ رہی ہے۔ اس کے باوجود آپ دیکھتے ہیں کہ سر پر اینٹوں کا ٹوکرا اٹھا کر تیسری منزل پر لے جانے والی مزدور عورت کو اس مرد سے کم مزدوری ملتی ہے جو اوپر بیٹھا دیوار پر پالش کر رہا ہے۔ یہ عورت ہونے کی سزا ہے۔

سوال: آج کل فکشن خصوصاً افسانہ نگاری میں نقاد کو بے دخل کرنے کا رجحان پیدا ہوا ہے۔ یعنی ایک طرف اگر

نقادوں کی نثری اصناف کے تئیں لاتعلقی ہے تو دوسری طرف افسانہ نگاروں میں ادعائی ذات (Self Assertion) کا جذبہ ابھررہا ہے۔ آپ نقاد اور تخلیق کار کے رشتے کو کس طرح دیکھتی ہیں؟

جواب: آج تحقیقی تنقید کا معیار تو بہت بلند ہے۔ اس وقت اردو کے جو محقق نقاد ہیں، وہ ادب کا بہت بڑا سرمایہ ہیں۔ لیکن نئے نقادوں میں اپنے دوستوں کی تعریف کو تنقید قرار دینے کا رجحان بڑھ رہا ہے۔ میں تنقید اور تخلیق کے درمیان مصلحت اور دوستی کی بنیاد کو پسند نہیں کرتی۔ میں تو سمجھتی ہوں کہ افسانے کا سب سے اہم نقاد اس کا قاری ہے اور آج ہمارے افسانے پڑھنے والے قاری کی نگاہ سارے عالمی ادب پر ہے۔ لیکن آج کے افسانے کے تنقید نگار اکثر دوستی کے رشتے کو اہمیت دیتے ہیں اور اس کے لیے وہ سینئر اور اہم افسانہ نگاروں کی توہین کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔

اگر نقاد کسی افسانہ نگار کو بانس پر چڑھا سکتے یا زمین پر پٹک سکتے تو صرف منٹو اور بیدی کی بات کیجیے۔ منٹو کو ترقی پسند نقادوں نے فحش افسانہ نگار کہہ کر ترقی پسندی کے دائرے سے باہر کر دیا تھا۔ بیدی کو ہم عصر نقادوں نے کوئی اہمیت نہیں دی۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ یہ دونوں کئی نسلوں سے قاری کے ساتھ ہیں۔ میں سمجھتی ہوں نثری اصناف کے تئیں تنقید نگار کو اپنا رویہ بدلنا ضروری ہے۔

سوال: دکن میں بالعموم اور حیدرآباد میں بالخصوص اردو کی موجودہ صورتِ حال سے آپ کس حد تک مطمئن ہیں؟

جواب: اردو کی موجودہ صورتِ حال سے کوئی بھی مطمئن نہیں ہوسکتا۔ اردو کو باقی رکھنے کے لیے جہاں بھی کام ہو رہا ہے اس میں سب سے زیادہ توجہ اردو کی ابتدائی تعلیم کو دینا چاہیے۔

حیدرآباد میں اس وقت بہت سے ادارے اور اسکول اردو کے لیے کام کر رہے ہیں۔ خصوصاً روزنامہ "سیاست" کی طرف سے اردو کی ابتدائی تعلیم کے لیے بے مثال کام ہو رہا ہے۔ میرا خیال ہے حیدرآباد اور جنوب کے بہت سے شہروں میں مختلف ادارے جتنا اچھا کام کر رہے ہیں ویسا کام یوپی میں نہیں ہو رہا ہے۔ لیکن جب تک ہم اپنے بچوں کو اردو پڑھانا ضروری نہیں سمجھیں گے، اردو کے مستقبل سے مایوسی بڑھتی جائے گی۔

سوال: اردو ادب میں جدیدیت کے بعد اب مابعد جدیدیت کے مباحث کا آغاز ہوچکا ہے۔ بحیثیت ایک تخلیقی فنکار اس ضمن میں آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب: جدید، مابعد جدید اور ترقی پسند افسانے کو الگ الگ خانوں میں بانٹنے کی بحث میری سمجھ میں نہیں آتی۔ اردو افسانے کی ہر نئی تکنیک مغربی فکشن سے آئی ہے۔ افسانہ ہر دور میں اپنے عصری مسائل کا عکاس رہا ہے۔ ترقی پسند افسانہ نگار اگر انسان کے نفسیاتی اور جذباتی مسائل سے زیادہ اہمیت سیاسی، معاشی اور سماجی مسائل کو دیتے تھے تو آج کے مابعد جدید افسانہ نگار بھی فسادات، قتل و غارت گری اور آج کی دہشت پسند سیاست کے خلاف افسانے لکھ رہے ہیں۔

سوال: عہدِ حاضر میں الیکٹرانک میڈیا، پرنٹ میڈیا پر حاوی دکھائی دیتا ہے اور یہ اندیشہ ظاہر کیا جارہا ہے کہ الیکٹرانک میڈیا کی وجہ سے مطالعے کا ذوق کم ہوسکتا ہے۔ فکشن کے قارئین پر الیکٹرانک میڈیا کس حد تک اثرانداز ہورہا ہے؟

جواب: الیکٹرانک میڈیا سے یقیناً ہر زبان کی ریڈرشپ متاثر ہورہی ہے۔ لیکن میں سمجھتی ہوں کہ بھلے ہی پڑھنے والے کم ہو رہے ہوں مگر فکشن کی اہمیت بڑھ رہی ہے۔ کیونکہ ہر ٹی وی چینل کو اچھے سیریل اور اچھی کہانیوں کی ضرورت ہے۔ فلم، ریڈیو، اسٹیج اور ٹی وی ان سب کو اچھی کہانیوں کی تلاش ہے۔

میں اب تک دوردرشن کے لیے دو تین سیریل بنا چکی ہوں۔ ای. ٹی. وی. اردو کے لیے بھی ایک ڈیلی سوپ لکھا تھا۔ اردو کے پرانے افسانہ نگاروں کی کہانیوں اور آج کے لکھنے والوں کی اچھی کہانیوں کی میڈیا کو ضرورت ہے اور رہے گی۔

سوال: فکشن کی موجودہ صورتِ حال کے مدِنظر اردو فکشن کے مستقبل کی نوعیت کیا ہوگی؟

جواب: آج اردو فکشن ہندستان کی ساری زبانوں کو لیڈ کر رہا ہے۔ یہ دوسری زبانوں کے اہم نقادوں کی رائے ہے۔

سوال: اردو زبان کے فروغ کے لیے قومی اردو کونسل نے جو مختلف اقدامات کیے ہیں، ان سے آپ کس حد تک مطمئن ہیں؟ اردو زبان کے فروغ کے لیے مزید کیا اقدامات کیے جاسکتے ہیں؟

جواب: میں قومی اردو کونسل کے قیام کے بعد اس کے ایڈوائزری بورڈ کی ممبر تھی اور اس وقت اس ادارے کے بنیادی کاموں کے پروجیکٹ تیار ہوئے تھے۔ اس کے بعد میرا اس ادارے سے کوئی ربط نہیں رہا۔ لیکن میں جانتی ہوں کہ ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ اور نارنگ صاحب اردو کی بقا کے ہر پہلو پر بہت اچھا کام کر رہے ہیں۔ اس کا اندازہ مجھے "اردو دنیا" کے ہر شمارے سے ہوتا ہے۔

سوال: "اردو دنیا" کے قارئین کے لیے آپ کا پیغام؟

جواب: پیغام دینا تو پیغمبروں، اوتاروں اور لیڈروں کا کام ہے۔ فیض نے یہ شعر ہمارے لیے کہا ہے:

ہم شیخ نہ لیڈر، نہ مصاحب، نہ صحافی
جو خود نہیں کرتے، وہ ہدایت نہیں کرتے

356, Jhelam Hostel, JNU, New Delhi-110067

□□□

مہ نور زمانی

("اردو اصناف (نظم و نثر) کی تدریس" سے اقتباس)

مثنوی ــــ تعارف، ارتقا اور تدریس

مثنوی اردو شاعری کی ایک اہم صنف ہے۔ ہیئت کے اعتبار سے ایسے ہم وزن اشعار کے مجموعے کو مثنوی کہا جاتا ہے جس میں ہر شعر کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوں اور ہر شعر اپنے پہلے اور بعد کے شعر سے مختلف قافیہ رکھتا ہو۔

لفظ ''مثنوی'' عربی زبان کے لفظ مثنیٰ سے مشتق ہے جس کا مطلب دو دو علاحدہ کرنا ہے۔ چونکہ صنف مثنوی کا ہر شعر اپنے سے پہلے اور بعد کے اشعار سے علاحدہ دو قافیوں کا حامل ہوتا ہے اس لیے اس صنف کو مثنوی کا نام دیا گیا ہے۔ مثنوی کی ہیئت کا خاکہ حسب ذیل ہے:۔

ب-----------------ب

ج-----------------ج

د-----------------د

ف-----------------ف

مثنوی اردو شاعری کی ایک بیانیہ اور توضیحی صنف ہے۔ اس میں شاعر اپنے کسی خیال یا مقصد کو یا تو راست طور پر بیانیہ انداز میں نظم کر دیتا ہے یا کسی داستان یا قصے کے روپ میں پیش کرتا ہے۔

سیدھے سادے بیانیہ انداز میں قلمبند کی جانے والی مثنویاں اکثر کسی مخصوص موضوع پر لکھی جاتی ہیں۔ ایسی مثنویاں عموماً مختصر ہوتی ہیں۔ مثلاً میر کی ''مثنوی دربیانِ ہولی'' مثنوی در تعریفِ آغا رشید خطاط'' حالی کی ''برکھارت''۔ داستان یا قصے کی صورت میں بیان ہونے والی مثنویاں عموماً طویل ہوتی ہیں اور ان میں قصہ گوئی کے تمام اجزا پائے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی تشکیل میں باقاعدہ ایک خاص ترتیب کو برتا جاتا ہے۔

ان میں سب سے پہلے'' حمد'' لکھی جاتی ہے۔ پھر نعتِ رسول، اس کے بعد'' مدح فرماں روائے وقت'' کے عنوان سے اپنے زمانے کے بادشاہ یا کسی وزیر یا رئیس کی تعریف بیان کی جاتی ہے بعد میں شاعر کبھی کبھی'' تعریفِ سخن'' کا حصہ بھی شامل کرتا ہے جس میں وہ سخن کی اہمیت اور اپنی فنکاری کی مدح و توصیف کرتا ہے۔ اس کے علاوہ کبھی کبھی اپنے خاندان، اپنی جائے پیدائش، تاریخ ولادت وغیرہ بیان کرتا ہے جس کے باعث یہ حصہ نہایت اہمیت کا حامل بن جاتا ہے۔

کبھی کبھی مثنوی قلمبند کرنے کے مقصد پر بھی "سبب تصنیف" کے عنوان سے روشنی ڈالی جاتی ہے۔

یہ تمام حصے درحقیقت تمہید کی حیثیت رکھتے ہیں، اس کے بعد اصل قصہ شروع ہوتا ہے۔ تقریباً تمام داستانوی مثنویوں میں مثنوی کے اجزائے ترکیبی کی یہی ترتیب ملتی ہے، خصوصاً قدیم اردو مثنویاں اس نہج پر لکھی گئی ہیں۔

ویسے بعض مثنوی نگار ان اجزا میں سے کسی جز کو نظر انداز کر دیتے ہیں یا اپنی پسند کے مطابق ان کی ترتیب میں ردو بدل بھی کر لیتے ہیں۔

قصے میں قصہ گوئی کے تمام اجزائے ترکیبی یعنی پلاٹ، کردار نگاری، جذبات نگاری، سراپا نگاری، مکالمہ نگاری اور منظر نگاری، جزئیات نگاری سبھی پہلو پائے جاتے ہیں۔ ان کی تفصیل ذیل میں درج ہے۔

پلاٹ: کسی بھی کہانی میں واقعات کی ترتیب کو پلاٹ کہا جاتا ہے۔ مثنوی کے قصے میں بھی پلاٹ کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ عموماً مثنویوں کے پلاٹ سادہ ہوتے ہیں اور قصہ ابتدا و ارتقا کی منزلوں سے گزرتا ہوا اختتام کو پہنچ جاتا ہے۔

کردار نگاری: کردار کہانی کا اہم حصہ ہوتے ہیں۔ اردو مثنویوں کے قصوں میں عام طور پر بادشاہ، شہزادے، شہزادیاں، وزیر زادے، ماما ئیں، کنیزیں، جادوگر، نجومی اور دیو، جن اور پری جیسے کردار ملتے ہیں، قدیم مثنویوں میں فوق الفطری ہستیوں کو بڑی اہمیت دی گئی ہے۔

فوق الفطری کردار مختلف حیوانی یا انسانی شکلیں اختیار کر کے انسان سے اپنی من مانی کروانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایک شکل سے دوسری شکل میں تبدیل ہو جانے کی قدرت بھی ان میں پائی جاتی ہے۔ اکثر کسی دیو یا بھوت کی جان کسی مقام پر پنجرے میں بند مینا یا طوطے کے قبضے میں ہوتی ہے جس کو مار ڈالنے کے بعد انسان کو دیو سے رہائی حاصل ہو سکتی ہے۔ قدیم مثنویوں میں ان کرداروں کی شرکت اس بات کی دلیل ہے کہ اس وقت کا انسانی ذہن اَن دیکھی قوتوں کے وجود پر گہرا اعتقاد رکھتا تھا۔

انسانی کردار مثنوی نگاروں کے اپنے وقت کی تہذیبی اور معاشرتی قدروں کے حامل ہوتے ہیں۔ کہانی چاہے کوئی بھی ہو، کرداروں کے

● تدریس ایک مقدس پیشہ بھی ہے اور ایک فن بھی۔ استاد کے لیے اپنے طلبہ تک موضوع سے متعلق معلومات کی بہتر ترسیل کے لیے ضروری ہے کہ اس موضوع سے متعلق اس کا گہرا مطالعہ بھی ہو اور وہ ترسیل کے طریقے سے بھی آگاہ ہو۔ قومی اردو کونسل نے فن تدریس سے متعلق کئی اہم کتب شائع کی ہیں۔ زیرِ نظر شمارے میں "اردو اصناف (نظم و نثر) کی تدریس" سے اقتباس پیش کیا جا رہا ہے۔

طور طریقے، عادات واطوار، اعمال و اخلاق، رہن سہن اور لباس و گفتگو وغیرہ مثنوی نگار کے ماحول اور زمانے کی آئینہ داری کرتے ہیں۔

جذبات نگاری: مثنوی نگار کرداروں کے جذبات کی تمام باریکیوں کو اپنے پیشِ نظر رکھتا ہے۔ جب وہ کرداروں کی جذبات نگاری کرتا ہے تو صداقت اور حقیقت پسندی سے کام لے کر کرداروں کے حسب مراتب ان کے جذبات کی ترجمانی کرتا ہے۔ ان کی داخلی کیفیات، نفسیاتی الجھنوں اور عمل و ردعمل کی کڑیوں کو نمایاں کرنے اور سلجھانے میں مہارت اور واقفیت کو کافی دخل ہوتا ہے۔

قدیم اردو مثنویوں مثلاً غواصی کی مثنوی ''مینا ستونتی''، نصرتی کی ''گلشنِ عشق'' میں پھر میر حسن کی ''سحرالبیان'' میں اور میر کی ''دریائے شوق'' وغیرہ میں جذبات نگاری کے اعلا نمونے ملتے ہیں۔

مکالمہ نگاری: مکالمہ نگاری داستانوی مثنویوں کی کامیابی کا ایک اہم پہلو ہے۔ یہ جز دوسری اصناف سے کہیں زیادہ مثنوی میں اپنا اثر دکھاتا ہے کیونکہ یہاں نظم کا پیمانہ نثر کے مقابلے میں نہایت محدود اور نپا تلا ہوتا ہے۔ وہ مہارت اور چالاکی سے کام لے کر جچے تلے الفاظ میں کرداروں کی باہمی بات چیت کو جاندار مکالموں کی صورت میں پیش کرنے اور حسب موقع مختصر یا طویل مکالموں کو تشکیل دے کر کرداروں کے جذبات و خیالات کی عمدہ ترجمانی کرتا ہے۔

بہترین مکالمہ نگاری کی مثالیں کئی مثنویوں میں ملتی ہیں خصوصاً ''گلزارِ نسیم'' کو اس سلسلے میں بے حد مقبولیت حاصل ہے۔ درج ذیل مکالمہ اس کی واضح مثال ہے:

پوچھا اے آدم پری رو
انسان ہے پری ہے کون ہے تو
کیا نام ہے اور وطن کدھر ہے
ہے کون سا گل؟ چمن کدھر ہے
دی اس نے دعا کہا باصد سوز
فرخ ہوں شہا! میں ابنِ فیروز

محاکات نگاری: محاکات نگاری کسی چیز کے ایسے بیان کو کہا جاتا ہے جسے پڑھ کر اس کا جیتا جاگتا نقشہ آنکھوں میں پھر جائے۔ تقریباً ہر مشہور مثنوی میں عمدہ محاکات نگاری کی مثالیں مل جاتی ہیں۔

منظر نگاری: کسی قدرتی منظر یا واقعہ کے خارجی ماحول اور مادی عناصر کی آئینہ داری کو منظر کشی کہا جاتا ہے۔ داستانوی مثنویوں کے علاوہ راست طور پر لکھی جانے والی مثنویوں میں بھی منظر نگاری کے انتہائی کامیاب نمونے مل جاتے ہیں۔ قطب شاہی اور عادل شاہی ادوار کی مثنویوں سے لے کر سیاسی حالات پر مبنی علی سردار جعفری کی مثنوی ''جمہور'' میں بھی منظر نگاری کے شاہکار نمونے پائے جاتے ہیں۔

جزئیات نگاری: جزئیات نگاری کے ذریعے فنکار اپنے ماحول، ملک و تہذیب کی رنگارنگی، اور کرداروں کے داخلی و خارجی حالات و کیفیات کی بولتی ہوئی تصویریں اتار کر رکھ دیتا ہے۔ جزئیات نگاری کی مدد سے جب شاعر کسی چیز یا جذبے کی تمام تفصیلات کو بیان کرتا ہے تو منظر ہو یا واقعہ ہو یا کردار اس کا جیتا جاگتا نقش نگاہوں میں پھرنے لگتا ہے۔

صنف مثنوی میں اشعار کی تعداد پر کوئی پابندی عائد نہیں ہے۔ مثنوی دس اشعار کی بھی ہوسکتی ہے اور دس ہزار اشعار کی بھی۔ کمال خاں رستمی کی مثنوی ''خاورنامہ'' چوبیس ہزار اشعار پر مشتمل اردو کی سب سے زیادہ طویل مثنوی ہے۔

مثنوی میں شاعر اپنی پسند اور ضرورت کے مطابق کسی بھی موضوع کو اپنا سکتا ہے۔ وہ قصیدہ گوئی کی طرح کسی کی تعریف بیان کرسکتا ہے، مرثیہ نگاری کی طرح کسی کی موت پر رنج وغم کا اظہار کرسکتا ہے، غزل گو کی طرح عشقیہ فضا پیدا کرسکتا ہے، اخلاق یا اصلاح کی باتیں پیش کرسکتا ہے، تصوف یا مذہب پر اظہار خیال کرسکتا ہے، کسی کی ہجو لکھ سکتا ہے، کسی شکار کی تفصیلات بیان کرسکتا ہے، کسی جنگ کا نقشہ قلمبند کرسکتا ہے، یا کسی تقریب کی روداد بھی پیش کرسکتا ہے۔ اظہر علی فاروقی نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ''معمولی سے معمولی چیز بھی اس کا موضوع بن سکتی ہے، مرزا سودا کی لاٹھی ہو یا میر کا گھر، حامد اللہ افسر کے گھر کے صحن کا نیم ہو یا دیا شنکر نسیم کا شہزادہ تاج الملوک اور بکاولی کی داستانِ عشق یا میر تقی میر کے شکارنامے، کائنات کی ہر چیز مثنوی کی صورت میں پیش کی جاسکتی ہے۔'' مثنوی ''رموز العارفین'' میں میر حسن نے بلخ کے بادشاہ ابراہیم ادہم کے سلطنت چھوڑ کر درویشی اختیار کر لینے کے قصے کو تصوف کے رموز و نکات کے جابجا ذکر سے مزین کر کے پیش کیا ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس مثنوی کا اصل موضوع تصوف ہے۔ اس کے برخلاف مثنوی ''خوانِ نعمت'' میں میر حسن نے ان تمام کھانوں کا ذکر کیا ہے جو آصف الدولہ کے دسترخوان پر چنے جاتے تھے، جس سے واضح ہوتا ہے کہ یہ ایک معاشرتی پہلو پر مبنی مثنوی ہے۔ چنانچہ مثنوی کے کل سرمایے کو موضوع کے اعتبار سے ہم رزمیہ، عشقیہ، تاریخی، اخلاقی، معاشرتی، مذہبی اور تصوفانہ جیسے اقسام میں شمار کر سکتے ہیں۔

مثنویاں عموماً سیدھی سادی عام فہم زبان میں لکھی جاتی ہیں، ان کے لیے عموماً مندرجہ ذیل سات بحریں استعمال کی جاتی ہیں اور ایک خاص موضوع کے لیے شعرا نے ایک خاص بحر ہی کو استعمال کیا ہے۔

1- بحر ہزج مسدس اخرب مقبوض مقصور یا محذوف۔
(مفعول مفاعیلن فعولن)

2- بحر ہزج مسدس مقصور یا محذوف۔
(مفاعیلن مفاعیلن / مفاعیل یا فعولن)

3- بحر متقارب مثمن محذوف یا مقصور۔
(فعولن فعولن فعولن فعل یا فعول)

4- بحر رمل مسدس مخبون محذوف یا مقصور
(فاعلاتن فاعلاتن فاعلن یا فاعلات)

5- بحر رمل مسدس مخبون محذوف یا مقصور
(فاعلاتن فعلاتن فعلن)

6- بحر سریع مسدس محذوف و مقصور
(مفتعلن مفتعلن فاعلن یا فاعلات)

7- بحر خفیف مسدس مخبون مقطوع محذوف یا مقصور
(فاعلاتن مفاعلن فعلن)

مثنوی نگاروں نے ایک زمانے تک انھی بحروں میں مذکورہ بالا مثنویاں لکھی ہیں۔ لیکن بعد میں شعرا نے اس روایت سے بغاوت شروع کر دی مثلاً میر حسن نے عشقیہ مثنوی ''سحر البیان'' میں رزمیہ مثنویوں کے لیے استعمال کی جانے والی بحر کا استعمال کیا اور اپنی جادو بیانی کا سکہ بٹھا دیا۔ ان کے علاوہ حفیظ جالندھری نے بحر ہزج مثمن سالم میں اپنی مثنوی ''شاہنامۂ اسلام'' لکھ کر ادب میں نمایاں مقام حاصل کرلیا۔ ان مثنویوں میں موضوع کی اہمیت کے علاوہ بحروں کے جدت پسندانہ انتخاب نے بھی اہم رول ادا کیا۔

موضوع کی آزادی اور ہیئت اور ساخت کی سہولیات کے باعث مثنوی دیگر اصناف سخن کے مقابلے زیادہ اہمیت اور افادیت کی حامل سمجھی جانے لگی۔ مولانا حالی نے مقدمۂ شعر و شاعری میں لکھا ہے:

''الغرض جتنی صنفیں فارسی اور اردو شاعری میں متداول ہیں ان میں کوئی صنف مسلسل مضامین بیان کرنے کے قابل مثنوی سے بہتر نہیں ہے۔ یہ وہ صنف ہے جس کی وجہ سے فارسی شاعری کو عرب کی شاعری پر ترجیح دی جا سکتی ہے ------ اردو شاعری کی تمام اصناف میں سب سے زیادہ کارآمد یہ صنف ہے، کیونکہ غزل یا قصیدے میں اس وجہ سے کہ اول سے آخر تک ایک قافیے کی پابندی ہوتی ہے ہر قسم کے مسلسل مضامین کی گنجائش نہیں ہو سکتی۔۔''

اسی طرح مولانا شبلی نعمانی لکھتے ہیں:۔

''انواع شاعری میں یہ صنف تمام انواع شاعری کی بہ نسبت زیادہ مفید، زیادہ وسیع اور زیادہ ہمہ گیر ہے۔ شاعری کے جس قدر انواع ہیں سب اس میں نہایت خوبی سے ادا ہو سکتے ہیں۔ جذبات انسانی، مناظر قدرت، واقعہ نگاری، تخیل ان تمام چیزوں کے لیے مثنوی سے زیادہ کوئی میدان ہاتھ نہیں آسکتا۔۔۔۔''

اردو کے اولین نقاد مولانا حالی نے معیاری مثنویوں کی تخلیق کے سلسلے میں مشورہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ جو قصہ مثنوی میں بیان کیا جائے اس کی بنیاد ناممکن اور فوق العادت باتوں پر نہ رکھی جائے، ربط کلام کا لحاظ رکھا جائے خصوصاً جب کہ اس میں تاریخ یا قصہ بیان ہو رہا ہو، مبالغے کا استعمال صرف وہاں تک کیا جائے جہاں تک عقل انسانی میں وہ مبالغہ آجائے اور شعر تماشہ یا پہیلی نہ بن جائے۔ بیان مقتضائے حال کے موافق اور نیچرل ہونا چاہیے۔ اس بات کا بھی خاص طور سے خیال رکھنا چاہیے کہ ایک بیان دوسرے کی تکذیب نہ کرے، قصے کے ضمن میں کوئی ایسی بات نہ آجائے جو مشاہدے یا تجربے کے خلاف ہو۔

اردو مثنوی کا ارتقا

اردو میں بہمنی دور کے شاعر فخرالدین نظامی بیدری کی مثنوی ''کدم راؤ پدم راؤ'' سے صنف مثنوی کی ابتدا ہوئی۔ نظامی نے اسے بہمنی سلطنت کے نویں بادشاہ احمد شاہ ولی بہمنی کے زمانے میں 825ھ سے 838ھ بمطابق 1421ء تا 1434ء لکھا تھا۔ اس میں فارسی بحر میں ہندوی زبان میں ایک عشقیہ قصہ بیان کیا گیا ہے۔ اس کے بعد بابا فرید گنج شکر (864ھ) اور عبدالقدوس گنگوہی (860ھ تا 945ھ) کے ملفوظات مثنوی کی شکل میں دستیاب ہوتے ہیں۔ نویں صدی ہجری کے آخر میں قطبن کا لکھا ہوا ایک قصہ'' مرگاوتی'' بھی ملتا ہے۔

ان ابتدائی نمونوں کے بعد دسویں صدی ہجری میں گجرات اور دکن کے بیجاپور اور گولکنڈا کے علاقوں میں مثنوی کو بے انتہا ترقی دی گئی۔ 986ھ میں گجرات کے صوفی بزرگ خوب محمد چشتی کی مثنوی ''خوب ترنگ'' ایک اہم طویل مثنوی ہے، ان کے علاوہ 902ھ میں وفات پانے والے حضرت میراں جی شمس العشاق کی چند مثنویاں جیسے خوش نامہ، خوش نغز، شرح مرغوب القلوب وغیرہ خاص اہمیت رکھتی ہیں۔

897ھ میں بیجاپور کی سلطنت کے وجود میں آنے کے بعد ابراہیم عادل شاہ کے دور (988ھ) سے مذہب، تصوف، فقہ، عقائد، جنگ وجدل اور عشق وعاشقی کے موضوعات پر مبنی مثنویوں کی تخلیق کا ایک طویل سلسلہ جاری ہو گیا۔

999ھ میں حضرت میراں جی کے فرزند حضرت جانم نے فارسی کی بحروں کو اپنا کر'' منفعت الایمان''''وصیت الہادی'' اور طویل مثنوی'' ارشاد نامہ'' کے علاوہ اور بھی کئی مثنویاں لکھیں جن کا موضوع خالص تصوف تھا۔

بیجاپور میں ابراہیم عادل شاہ (988ھ۔ 837ھ) کے دور میں مقیمی نے دو عشقیہ مثنویاں'' چندر بدن و مہیار'' اور'' سومہار کی کہانی'' لکھیں۔ چندر بدن، طبع زاد مثنوی تھی اور مقیمی کے مطابق قطب شاہی سلطنت کے مشہور شاعر غواصی کی مثنوی'' سیف الملوک و بدیع الجمال'' سے متاثر ہو کر اس نے یہ مثنوی لکھی تھی۔ اس عجیب و غریب قصے کو ایک طویل مدت تک ذوق و شوق سے پڑھا جاتا رہا اور لازوال شہرت ملی، مقیمی کے معاصر شاعر نے

''بہرام وحسن بانو'' لکھی لیکن اس کی تکمیل نہ کر پایا، دولت نے اسے مکمل کیا۔

محمد عادل شاہ (1037 تا 1067ھ) کے عہد میں صنعتی نے حضرت تمیم انصاری کی مہمات کے بیان پر مشتمل مثنوی ''قصۂ بے نظیر'' لکھی، کمال خاں رستمی نے فارسی کی مثنوی ''خاور نامہ'' کو اردو کا جامہ پہنایا، اسی دور میں ملک خوشنود نے ''ہشت بہشت'' اور ''یوسف وزلیخا'' مثنویاں لکھیں۔ علی عادل شاہ کے دربار کے ملک الشعرا ملانصرتی کو تو مثنوی نگاری میں نہایت بلند مرتبہ حاصل تھا۔ اس نے رزمیہ اور عشقیہ دونوں قسم کی مثنویوں میں مہارت دکھائی ہے۔ ''علی نامہ'' نصرتی کی شاہکار رزمیہ مثنوی ہے جس میں علی عادل شاہ، مغلوں اور شیواجی کی باہمی جنگوں کے مرقعے پیش کیے گئے ہیں۔ اس دور میں شاہ ملک نے مثنوی ''احکام الصلوٰۃ'' لکھی، حضرت امین الدین اعلیٰ نے کئی تصوفانہ مثنویاں لکھیں، ہاشمی نے ایک طویل مثنوی ''یوسف زلیخا'' کے عنوان سے لکھی۔ قطب شاہی دور میں کئی شعرا نے مثنوی میں نام پیدا کیا۔ محمد قلی قطب شاہ کے درباری شاعر وجہی نے عشقیہ مثنوی ''قطب مشتری'' لکھ کر لافانی شہرت حاصل کی۔ محمد قطب شاہ (1020-1035) کے زمانے میں حسن شوقی نے رزمیہ مثنوی ''ظفر نامہ'' لکھی۔ عبداللہ قطب شاہ (1035-1083) کے عہدِ حکومت میں مثنوی کا فن عروج پر پہنچ گیا۔ اسی دور میں غواصی نے سیف الملوک وبدیع الجمال مثنوی لکھی جو الف لیلیٰ کے قصے سے ماخوذ تھی، غواصی کی دو اور مثنویاں مینا ستونتی اور طوطی نامہ ملتی ہیں۔ یہ تمام مثنویاں اس فن کی روایت کو سنوارنے، سجانے اور آگے بڑھانے میں نمایاں حصہ ادا کرتی ہیں۔ ابن نشاطی کی مشہور مثنوی ''پھول بن'' (1076ھ) بھی گولکنڈہ کی ناقابلِ فراموش مثنوی ہے۔ اس کے بعد ابوالحسن تانا شاہ کے دور میں فائز اور لطیف نے مثنویاں لکھیں۔

گولکنڈہ کے آخری بادشاہ سکندر عادل شاہ کے عہد میں ادب کی سرپرستی رک گئی تو وہاں کے شعرا ویلور، ارکاٹ اور اورنگ آباد وغیرہ مقامات کی طرف کوچ کر گئے۔ ان میں سے کئی شعرا نے مثنوی کی روایت کو برقرار رکھا، ان میں سے ولی ویلوری، سراج اورنگ آبادی کی مثنویاں بھی مشہور ہیں۔

اورنگ زیب کے دکن کو فتح کر لینے کے بعد جب ولی اورنگ آبادی دلی پہنچتے ہیں اور وہاں ریختہ گوئی کا چرچا زور پکڑنے لگتا ہے تو وہاں کے شعرا بھی مثنویاں لکھنے میں آگے نکل جاتے ہیں۔ ادھر دکن میں دنیا سے سیر ہو کر شعرا مذہب اور تصوف کی طرف زیادہ مائل نظر آتے ہیں۔ بحری کی ''من لگن'' وجدی کی ''پنچھی باچھا'' اور عشرتی کی ''دیپک پتنگ'' اس زمانے کی مشہور مثنویاں ہیں۔

عادل شاہی اور قطب شاہی سلطنتوں کے زوال کے بعد ٹیپو سلطان کے عہد اور عہد آصف جاہی میں بھی مثنویوں کا ایک بڑا ذخیرہ ملتا ہے اس میں چھوٹی چھوٹی مذہبی مثنویوں سے لے کر انتہائی طویل مثنویاں بھی ملتی ہیں جن میں تاریخی، سوانحی، عشقیہ، رزمیہ اور بزمیہ موضوعات کو اپنایا گیا ہے۔

1750 میں دوسو چوبیس سالہ مغلیہ سلطنت کے قدم اکھڑ گئے تو اس کے بعد دلی میں زندگی بسر کرنا شعرا کے لیے بے حد مشکل ہو گیا، وہ اودھ کی نسبتاً پرامن فضا میں سانس لینے کے لیے لکھنؤ اور اس کے اطراف واکناف کو ہجرت کر گئے۔ ایسے میں کوئی طویل قابلِ قدر مثنوی تصنیف نہیں ہو پائی۔ دور قدیم کے شعرا حاتم، فائز، آبرو، خان آرزو وغیرہ نے غزلوں کو اہمیت دی۔ فائز نے مناجات، تعریف پنگھٹ اور تعریف جوگن جیسی مختصر مثنویاں لکھیں جن میں ہندستان کے پھولوں اور پھلوں کو تشبیہوں اور استعاروں کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔

فائز کے بعد میر اور سودا نے جو کہ دور متوسطین کے شعرا میں سے تھے اپنے سے پہلے کی مثنویوں میں موجود زبان و بیان کی خامیوں کو دور کر کے زبان میں نکھار اور بیان میں نزاکت پیدا کرنے کی کوشش کی۔ میر کی مثنوی ''دریائے عشق'' اور ''ہجور رخانۂ خود'' کافی مشہور مثنویاں ہیں۔ اسی طرح سودا کی ''مثنوی در ہجل راجہ نرپت سنگھ'' اور ''در ہجو شیدی فولاد خاں کوتوال'' کو بھی شہرت حاصل رہی ہے۔ سودا نے دو مکتوباتی مثنویاں بھی لکھیں جو ''خط درشکایت'' اور ''خط دراشتیاق'' ہیں۔ میر کے شکارنامے جو مثنوی کے پیرائے میں ہیں۔ نواب آصف الدولہ کے شکار کھیلنے، موسم اور جنگل کی سحر کاری کے چھانے اور جانوروں کے بھاگنے کی جاندار عکاسی کرتے ہیں۔

اسی دور میں میر حسن نے 1784 میں مثنوی ''سحر البیان'' قلمبند کر کے لافانی شہرت حاصل کر لی۔ ان کے علاوہ انشا، مصحفی، جرأت، راسخ، سعادت یار خان رنگین، مومن، داغ، واجد علی شاہ، محسن کاکوروی اور احمد علی شوق کو بھی مثنوی نگاری میں اہم مقام حاصل ہے۔ مرزا شوق کی مثنوی ''زہر عشق'' بھی لافانی شہرت کی مالک ہے۔ سحر البیان کی ٹکر پر لکھی گئی دبستان لکھنؤ کی مشہور زمانہ مثنوی ''گلزار نسیم'' ایک اور شہرت یافتہ مثنوی ہے جس میں زبان و بیان کی خوبیاں، اختصار اور صنعتوں کا استعمال اس کی سب سے بڑی خوبی ہے لیکن بعض خامیاں بھی اس میں پائی جاتی ہیں، اس کی خوبیوں اور خامیوں کو اس قدر زیر بحث لایا گیا کہ اردو ادب کی تاریخ کا سب سے بڑا معرکہ یعنی ''معرکۂ شرر وچکبست'' وجود میں آگیا۔

ان شعرا کے بعد جب سرسید اور حالی کی کوششوں سے اردو نثر اور نظم کے دھاروں کا رخ بدلنے لگا اور جدید رجحانات کو اہمیت حاصل ہونے لگی تو حالی، محمد حسین آزاد، اسماعیل میرٹھی کی مثنویاں ایک علاحدہ ہی آب و تاب کے ساتھ منظر عام پر آئیں۔ حالی کی ''حب وطن'' اور ''برکھا رت''، شبلی کی ''صبح امید'' اور اسماعیل میرٹھی کی چھوٹی چھوٹی مثنویوں میں زندگی کے حرکی ہونے کا تصور، جدلیت کا شعور، حب وطن کا راست اظہار اور دقیانوسی خیالات

سے بغاوت ان کا نمایاں وصف ہے۔

حفیظ جالندھری کے ''شاہنامۂ اسلام'' اور اقبال کا ''ساقی نامہ'' بھی کافی مشہور مثنویاں ہیں۔ ترقی پسند تحریک کے فروغ کے دوران بھی مثنویاں لکھی جاتی رہیں۔ علی سردار جعفری کی مثنوی ''جمہور'' اس دور کی بہترین مثال ہے جس میں انھوں نے شہنشاہیت اور عوام کی رسا کشی کا ذکر کر کے انقلاب کی اہمیت اجاگر کی ہے اور ایک حسین دنیا کی تعمیر کے خواب جگائے ہیں۔ اسی طرح کیفی اعظمی وغیرہ ترقی پسند شعرا نے مثنوی کی روایت کو اپنے دور میں زندہ رکھا۔ موجودہ دور تک آتے آتے مثنوی نگاری کی روایت ماند پڑ گئی ہے، صرف اکا دکا مثنویاں کہیں کہیں نظر آجاتی ہیں۔

مثنوی کی تدریس

مثنوی کی تدریس میں سب سے پہلے اس صنف کی ہیئت اور اس کے فن پر روشنی ڈالنے اور پھر اس کے ارتقا کی مختصر تاریخ بیان کرنے کا اہتمام کرنا ہوگا۔ اس سلسلے میں اردو مثنوی کی ابتدا کے بارے میں بتایا جاسکتا ہے کہ سوائے مثنوی ''کدم راؤ پدم راؤ'' کے دوسری تمام ابتدائی مثنویاں سماجی فلاح و بہبود اور خاص مسلک کی تبلیغ یا صوفیانہ خیالات کی اشاعت کے لیے وجود میں آئی تھیں۔ حضرت شمس العشاق کی خوش نامہ یا خوش نغز، وغیرہ اس کی مثالیں ہیں۔ جب زبان و بیان کا دامن وسیع ہونے لگا تو بتدریج موضوعات کا دائرہ پھیلتا گیا اور ترجمے کی صورت میں بھی مثنویاں لکھی جانے لگیں۔ زندگی کے تمام شعبے مثنوی نگاروں کی فکر و فن کا مرکز بن گئے۔ اس مرحلے میں کئی طویل داستانی مثنویاں لکھی گئیں مثلاً میر حسن کی سحر البیان یا وجہی کی قطب مشتری یا نصرتی کی گلشن عشق وغیرہ کے حوالے سے کردار نگاری، جذبات نگاری اور مکالمہ نگاری کی پہچان کرائی جاسکتی ہے۔ اس کے علاوہ قصے کی ابتدا، ارتقا، منتہا اور اختتام کا جائزہ لیا جاسکتا ہے اور مثنوی کے ابتدائی اجزا مثلاً حمد، نعت وغیرہ کی طرف توجہ دلائی جاسکتی ہے۔

اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ دکنی مثنویوں کا لسانی مطالعہ طالب علم کے لیے تحقیق کی نئی جہات استوار کرسکتا ہے۔ تلفظ اور املا کے اعتبار سے ان مثنویوں میں متروک الفاظ کی تلاش، ان کی نشاندہی اور اردو زبان کے ارتقا میں ان الفاظ کے مقام اور اہمیت کا پتہ لگانے پر طلبہ کو متوجہ کرنا ایک اہم کام ہے لہٰذا محنت اور خلوص کے ساتھ مثنوی کی تدریس کے ذریعے طلبہ میں تلاش و جستجو کے مادّے کو تحریک دے کر ان میں محققانہ بصیرت پیدا کرنے کی کوشش کی جاسکتی ہے۔ مثنوی کی تدریس میں اس بات پر خاص توجہ دینی چاہیے کہ مثنویاں تاریخ کے مختلف ادوار کی معاشرتی، تہذیبی اور ادبی قدروں کی نمائندگی کرتی ہیں۔ یہ محض روایتی قصے اور فرضی کہانیاں نہیں ہیں بلکہ اپنے اپنے عہد کی فکری، تہذیبی اور ادبی جہتوں کے پیمانے ہیں۔

''سحر البیان'' پر گفتگو کرنے سے پہلے اس کے مصنف میر حسن کا تعارف کرانا ہوگا۔ میر حسن کے مختصر تعارف کے بعد ان کی اس مثنوی کی خصوصیات پر روشنی ڈالی جاسکتی ہے اور اس کا مکمل جائزہ پیش کیا جاسکتا ہے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے یہ بتایا جاسکتا ہے کہ میر حسن پہلے شاعر ہیں جنھوں نے طبع زاد قصے سحر البیان کے ذریعے جاگیردارانہ طبقے کی معاشرت کی مکمل تصویر پیش کی ہے۔

مثنوی سحر البیان کا آغاز حمد، نعت اور منقبت سے متعلق اشعار کے سلسلے سے ہوتا ہے جو مثنوی کی روایت کے عین مطابق ہے۔ اس حصے سے اس وقت کے مذہبی اقتدار اور عقائد کی جھلک ملتی ہے۔ اس کے بعد مثنوی کے پلاٹ پر روشنی ڈالی جاسکتی ہے۔

جہاں تک پلاٹ کا تعلق ہے اس کے بارے میں واضح کرنا ہوگا کہ سحر البیان ایک طویل مثنوی ہے لیکن پلاٹ کے اعتبار سے عمدہ ہے۔ واقعات کا سلسلہ نہایت مربوط ہے اور کہیں کوئی جھول نہیں ہے۔ بیان میں ایسا تسلسل ہے جو مفہوم کے سمجھنے میں کوئی الجھن پیدا ہونے نہیں دیتا۔ یہ ایک طبع زاد قصہ ہے جو ہند آریائی قصوں پر مبنی ہے۔ سینہ بہ سینہ کئی قصوں میں بادشاہوں کے بے اولاد رہنے، نجومیوں کی پیش گوئیوں کے مطابق صاحب اولاد بن جانے، کسی شہزادی، کسی جن یا پری کے سائے میں آجانے جیسے توہمات یا شہزادے یا شہزادی کا قید میں پھنس جانے یا ان کے دوستوں کا بھیس بدل کر مدد کے لیے نکل پڑنے کے واقعات بیان کیے گئے ہیں۔ اس طرح سحر البیان میں کہانی یا پلاٹ کے اعتبار سے کوئی جدت نہیں پائی جاتی لیکن کردار نگاری، جذبات نگاری، سراپا نگاری، منظر نگاری اور زبان و بیان میں مصنف نے جس فنکاری سے کام لیا ہے اور تہذیبی اقدار و ثقافتی مظاہر کی رنگا رنگ دنیا آباد کی ہے، لافانی اہمیت اور شہرت کا باعث بن گئی ہے۔

میر حسن نے کردار نگاری کے اعتبار سے سحر البیان میں کمال مہارت کا مظاہرہ کیا ہے۔ مثنوی میں سب سے پہلے ہم بادشاہ کے کردار سے متعارف ہوتے ہیں، اس کے بعد کہانی کے ہیرو بے نظیر کا کردار آتا ہے۔ اس کے علاوہ کہانی کی ہیروئن بدر منیر، اس کی سہیلی نجم النسا، ایک پری ماہ رخ اور جنوں کے شہزادہ فیروز بخت کے کردار سامنے آتے ہیں۔ ان کے علاوہ کنیزوں اور رقاصاؤں وغیرہ کے کردار بھی ملتے ہیں۔

تمام کرداروں کے حلیے، ان کے اعتقادات، جذبات اور عقل و شعور کو پیش کرنے میں میر حسن نے انتہائی مہارت اور فنکاری سے کام لیا ہے۔ بادشاہ کی کردار نگاری میں اس ماحول اور معاشرت کی پوری عکاسی کی گئی ہے۔ ہیروئن بدر منیر کے ذریعے بھی شاہانہ ماحول کی عکاسی کی گئی ہے، وہ بھی

عشقیہ جذبات سے مغلوب ہے۔ اپنی سہیلی نجم النسا کے ایک اشارے پر بے نظیر کو دعوتِ ناؤ نوش دیتی ہے۔ کہانی کے کسی مرحلے پر اس میں تہذیب و شرافت کی جھلک نہیں ملتی، اس کے کردار کی صرف یہ خوبی ہے کہ وہ عشق میں وفاداری اور پائیداری برتتی ہے۔

نجم النسا جو وزیر زادی ہے اور بدرِ منیر کی سہیلی بھی ہے، حرکت و عمل کے اوصاف کا نمایاں پیکر ہے۔ کہانی کے دوسرے کرداروں کے بے عمل اور جمود کے برخلاف اپنے مشوروں اور اپنی حرکتوں سے کہانی کو جاندار اور دلچسپ بنا دیتی ہے۔

میر حسن نے تمام کرداروں کے حلیے، ان کے اعمال و افعال اور اعتقادات کو بڑے موثر انداز میں پیش کیا ہے۔

مثنوی میں جب کرداروں کے لباس اور وضع قطع کا ذکر کیا جاتا ہے تو اس زمانے کے رہن سہن اور ملبوسات و زیورات وغیرہ کی تفصیلات سے ہمیں روشناس ہونے کا موقع ملتا ہے مثلاً "شہزادی" کے بارے میں میر حسن کا بیان ہے:

کروں اس کی پوشاک کا کیا بیاں
فقط ایک پشواز آبِ رواں
زبس موتیوں کی تھی سنجاف کل
کہے تو وہ بیٹھی تھی موتی میں حل
اور اک اوڑھنی جوں ہوا یا حباب
جسے دیکھ شبنم کو آوے حجاب
وہ کرتی میں انگیا جواہر نگار
نیا باغ اور ابتدائے بہار

جذبات نگاری: اس میں میر حسن کو کمال مہارت حاصل ہے، رحم ہو یا قہر، نفرت ہو یا محبت، رشک ہو یا رقابت، عشق ہو یا رقابت، ہر طرح کے جذبات کو مناسب موقع پر انھوں نے نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً جب شہزادہ بارہ برس کی عمر کو پہنچتا ہے اور اس کی شاہی سواری جلوس کے بعد بخیر و عافیت محل واپس آتی ہے تو خوشی کے مارے محل کے باہر اور محل کے اندر جس طرح کا اظہار کیا جاتا ہے، اس کی عکاسی میر حسن نے بڑی خوبی کے ساتھ کی ہے۔

جہاں تک کہ تھیں خادمانِ محل
خوشی سے وہ ڈیوڑھی تک آئیں نکل
قدم اپنے حجروں سے باہر نکال
کیا سب نے آ پیشوا حال حال
بلائیں لگیں لینے سب ایک بار
کیا جی کو یکدست سب نے نثار

منظر نگاری میں بھی میر حسن کو حد درجہ کامیابی حاصل ہے۔ اس مثنوی میں منظر نگاری کے ان گنت مواقع آئے ہیں اور مصنف نے ہر جگہ اپنی مہارت کا ثبوت دیا ہے۔ مندرجۂ ذیل اشعار میں ان کے اس کمال کو بخوبی محسوس کیا جا سکتا ہے:

گلوں کا لبِ نہر پر جھومنا
اسی اپنے عالم میں منہ چومنا
وہ جھک جھک کے گرنا خیاباں پر
نشے کا سا عالم گلستان پر
چمن آتشِ گل سے دہکا ہوا
ہوا کے سبب باغ مہکا ہوا
خوشی سے گلوں پر سدا بلبلیں
تعشق کی آپس میں باتیں کریں

ان اشعار کو پڑھ کر ایک ایسے چمن کا نظارہ آنکھوں میں پھر جاتا ہے جس پر بہار آئی ہوئی ہے۔ منظر نگاری کی ایسی کئی مثالیں مثنوی میں متعدد مقامات پر نظر آتی ہیں۔ درحقیقت میر حسن نے اس مثنوی کے ذریعے صاف ستھری اور سادہ زبان کو سلیقے کے ساتھ برتنے میں اپنی استادی کا لوہا منوالیا، اس کے علاوہ مثنوی کی ہیئت۔ اور ساخت کو بھی انھوں نے خوبی کے ساتھ نبھایا ہے۔

استاد کو چاہیے کہ نصاب میں شامل کسی بھی مثنوی کی تدریس کے دوران فنِ مثنوی کے مذکورہ بالا تمام اجزائے ترکیبی کی نشاندہی کرتا جائے اور مثنوی کے متن کو یا تو شروع سے آخر تک پڑھائے یا اس کے تمام اجزائے ترکیبی سے متعلق اہمیت رکھنے والے چیدہ چیدہ حصوں کو طلبہ کے سامنے پڑھ کر ان کی پہچان کراتا جائے۔

مثنوی کے فن سے متعلق "اردو مثنوی کا ارتقا" از عبدالقادر سروری "اردو مثنوی شمالی ہند میں" از گیان چند جین نہایت اہم ہیں۔ ڈاکٹر فہمیدہ بیگم کی کتاب "اردو مثنوی — مطالعہ اور تدریس" کئی پہلوؤں سے اہمیت رکھتی ہے۔

مثنوی سحرالبیان کی تدریس کے سلسلے میں رشید حسن خاں کی کتاب "تین مثنویاں" کافی اہم ہے اور رضیہ سلطانہ علوی کے شائع شدہ تحقیقی مقالے "مثنوی سحرالبیان کا ایک تہذیبی مطالعہ" سے بھی استفادہ کیا جاسکتا ہے۔

□□□

"اردو انسائیکلوپیڈیا" جلد اول سے اقتباس

لاطینی زبان و ادب

لاطینی زبان

لاطینی زبان کا شمار سنسکرت کی طرح ان زبانوں میں ہوتا ہے جو اگرچہ زندہ نہیں ہیں لیکن اپنے شاندار ماضی، اپنے ادبی ورثے اور کئی جدید زبانوں کا سرچشمہ ہونے کے سبب اب بھی قدر و منزلت کی نظروں سے دیکھی جاتی ہیں۔ لاطینی زبان کی تعلیم آج تک یورپ اور امریکہ کی کئی جامعات کے نصاب میں شامل ہے اور کلیسا اور مذہبی رسومات میں اس کا استعمال اب بھی باقی ہے اور پاپائے روم کے علاقہ ویٹیکن (Vatican) میں اسے سرکاری زبان کی حیثیت حاصل ہے۔ پھر بھی اسے زندہ زبان نہیں کہہ سکتے۔

لاطینی زبان کا تعلق انڈو یورپی (Indo-European) زبانوں کے خاندان سے ہے اور اس کا نام وسطی اٹلی کے علاقہ لے شیم (Latium) سے ماخوذ ہے جہاں یہ بولی جاتی تھی اور جہاں سے یہ رومن جمہوریہ اور رومن شہنشاہی کی ترقی کے ساتھ ساتھ پہلے تو جزیرہ نمائے اطالیہ اور پھر سارے مغربی یورپ میں پھیلتی گئی۔ ایک انڈو یورپی زبان کی حیثیت سے لاطینی اور اس خاندان کی دوسری شاخوں مثلاً یونانی سنسکرت، المانوی (Germanic) اور سلاوی (Slavic) میں کافی مماثلت پائی جاتی ہے۔ مگر یہ نظریہ اب عام طور سے قبول کرلیا گیا ہے کہ یہ رشتہ محض لسانی ہے اور ان زبانوں کو بولنے والی قومیں کسی نسلی رشتے میں منسلک نہیں ہیں۔ یونانی اور لاطینی زبانوں میں غیر معمولی مماثلت پائے جانے کے سبب حال تک یہ سمجھا جاتا تھا کہ ان زبانوں کی بولنے والی قومیں ایک ہی اصل کی دو شاخیں ہیں لیکن اب اس نظریے کی تردید ہوچکی ہے۔ لاطینی دراصل کیلٹک (Celtic) زبانوں سے زیادہ قریب ہے۔

لاطینی زبان ابتدا میں وسطی اٹلی کی کئی بولیوں (dialect) میں سے ایک تھی۔ یہ اپنی نشو و نما کے شروع ہی میں تحریری زبان بن گئی۔ اس کے حروف تہجی جنوبی اٹلی میں رائج یونانی زبان سے لیے گئے۔ اس ابتدائی دور کے آثار وہ کتبات ہیں جو 500 قبل مسیح اور اس کے بعد کے زمانے سے ملتے ہیں اور ان کتبات کی زبان کلاسیکی دور کے رومیوں کے لیے بھی ناقابلِ فہم تھی اور آج بھی انھیں مکمل صراحت سے نہیں پڑھا جاسکا ہے اس وقت لاطینی کی حیثیت ایک غیر ترقی یافتہ بولی سے بڑھ کر نہیں تھی اور اس کا ذخیرۂ الفاظ بھی بہت محدود تھا جو ایک ترقی پذیر معاشرے کی ضروریات پوری کرنے سے بالکل قاصر تھا۔ دوسری اور تیسری صدی عیسوی کے دوران لاطینی ایک دہقانی بولی سے ترقی کرکے ایک توانا اور مکمل ادبی زبان میں تبدیل ہوگئی۔

اس قلب ماہیئت کے لیے دو امور کارگر رہے، ایک تو رومن اقتدار کی پورے جزیرہ نمائے اطالیہ میں توسیع جس کی وجہ سے لاطینی کے لیے یہ ضروری ہوگیا کہ وہ تجارت، کاروبار اور نظم و نسق کی ضروریات کی تکمیل کرسکے۔ اس کے الفاظ کی دولت میں غیر معمولی اضافہ ہوا اور اس کے صرف و نحو کی تدوین ہوئی۔ جمہوری طرز حکومت میں جو شہنشاہی کے قیام سے پہلے روم میں جاری و ساری تھا، فن تقریر اور خطابت کی بڑی اہمیت تھی جس سے اس زبان کی نشو و نما میں بڑی مدد ملی۔ دوسری قابل لحاظ بات یہ تھی کہ جنوبی اطالیہ کے یونانی نژاد باشندوں سے ربط قائم ہونے کے باعث یونانی زبان کے ادبی شاہ کاروں سے لاطینی ادیب اور شاعر روشناس ہوئے اور یونانی ادب کے عظیم الشان ورثے نے لاطینی ادب پر گہرا اثر ڈالنا شروع کیا اور لاطینی زبان کو نئے الفاظ، نئی ترکیبوں اور نئے طرز بیان سے مالا مال کردیا۔ لاطینی زبان کی بھرپور زندگی کا دور تقریباً ایک ہزار برس کا ہے جو پانچویں صدی قبل مسیح سے شروع ہوکر پانچویں صدی عیسوی تک قائم رہا۔ اس کے بعد مغربی یورپ میں وہ زبانیں وجود میں آئیں جو رومانس (Romance) زبانوں کے نام سے موسوم ہیں اور جو لاطینی ہی کی شاخیں تھیں۔ ان زبانوں میں زیادہ اہم فرانسیسی، اطالوی، ہسپانوی اور پرتگیزی ہیں۔ لاطینی زبان کے عروج کا زمانہ وہی ہے جو لاطینی ادب کی تاریخ میں دورِ زریں (Golden Age) کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے بعد اس کا دور سیمیں (Silver Age) شروع ہوا۔ جب زبان میں انحطاط پیدا ہوا اور اس میں غیر اجزا شامل ہونے لگے۔ لاطینی اب صرف رومیوں کی زبان نہیں رہی تھی بلکہ دوسرے ممالک اور علاقوں میں بھی رائج ہوچکی تھی۔ اس کے بعد کا دور انحطاط اور زوال کا دور ہے، جب اس زبان نے اپنی فطری توانائی کھودی اور اس میں اور ان زبانوں میں جو اس کی کوکھ سے پیدا ہوئی تھیں، فاصلہ بڑھتا گیا۔ یہ سچ ہے کہ قرونِ وسطیٰ میں لاطینی

● قومی اردو کونسل نے اردو انسائیکلوپیڈیا کی تین جلدیں شائع کی ہیں جن میں کلیدی مضامین شامل ہیں۔ پہلی جلد کی قیمت 300روپے اور بقیہ دو کی 450روپیہ فی جلد ہے۔ مختصر نوشتوں پر مشتمل ادب (قیمت۔ 300روپے)، تاریخ (قیمت۔ 228روپے)، سماجی علوم (قیمت۔228روپے)، جغرافیہ (قیمت۔254روپے) اور فنونِ لطیفہ (قیمت۔ 260روپے) پر مبنی جلدیں بھی شائع ہوچکی ہیں۔ اساتذہ اور طالب علموں کو ان پر 40فیصد کی خصوصی رعایت بھی دی جاتی ہے۔

بحیثیت علم وحکمت کی زبان کے باقی رہی اور کلیسا نے بھی اسے اپنا لیا لیکن یہ بول چال سے دور ہوگئی اور اس کا استعمال دانش گاہوں اور خانقاہوں تک محدود ہوکر رہ گیا۔

لاطینی ادب

عام معنوں میں لاطینی ادب سے مراد وہ ادب ہے جو لاطینی زبان میں لکھا گیا لیکن محدود اور زیادہ صحیح معنوں میں اس سے مراد وہ ادب ہے جو رومن دورِ حکومت کی پیداوار ہے۔ اس کا زمانہ تیسری صدی قبل مسیح یعنی رومن جمہوریہ کے قیام سے شروع ہوکر دوسری صدی عیسوی کے ختم تک یعنی رومن شہنشاہی کے زوال تک کا ہے۔ لاطینی ادب کی تاریخ کی ابتدا جیسا کہ اوپر بتلایا گیا ہے، یونانی ادب کے ترجموں سے شروع ہوتی ہے۔ اور اس کا عروج و زوال رومن سلطنت کے عروج و زوال سے وابستہ ہے۔ گو اس کے بعد بھی یعنی قرونِ وسطی میں نشاۃِ ثانیہ کے زمانے میں اور اس کے بعد بھی مغربی یورپ کے کئی لکھنے والوں نے اپنی ادبی تخلیقات کے لیے اپنی زبان چھوڑ کر لاطینی ہی کا استعمال کیا لیکن ان کی حیثیت اکثر و بیشتر صورتوں میں ایک علمی مشق سے بڑھ کر نہیں تھی۔ لاطینی ادب کی تاریخ کو چار نمایاں اَدوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ دورِ اوّل تیسری صدی قبل مسیح سے لے کر 90 قبل مسیح تک دورِ زرّیں (Golden Age) 90 قبل مسیح سے 14 عیسوی تک دورِ سیمیں (Silver Age) 14 عیسوی سے 117 عیسوی تک اور آخری دور 117 عیسوی سے تقریباً 180 عیسوی تک۔ یونانیوں سے سیاسی اور سماجی ربط ضبط قائم ہونے سے قبل بھی لاطینی قوم میں ادبی کاوشوں کا فقدان نہیں تھا۔ یہ ادبی کاوشیں زیادہ تر نیم تمثیلی تخلیقات، دعائیہ نظموں اور عوامی قسم کی بیانیہ شاعری پر مشتمل تھیں لیکن جنوبی اٹلی میں رہنے والے یونانی نژاد باشندوں سے ربط قائم ہونے پر یونانی کتابوں کا ترجمہ ہونے لگا اور یونانی اصناف سخن اپنائی جانے لگیں سب سے پہلے جن اصنافِ سخن کی طرف توجہ کی گئی وہ رزمیہ نظم (Epic) اور ڈراما تھیں اور شاید ابتدائی لکھنے والے رومن بھی نہیں تھے۔ لی وی یس (Livius) جنوبی اٹلی کے ایک یونانی باشندے نے ہومر کی مشہور نظم اوڈیسی (Odyssey) کا ترجمہ لاطینی نظم میں کیا۔ لاطینی ادب کی تاریخ کے پہلے دو بڑے نام تیسری صدی قبل مسیح میں ملتے ہیں وہ ہیں اینی یوس (Ennius) اور پلاٹس (Plautus)۔ اینی یوس نے کئی یونانی نظموں کا ترجمہ لاطینی میں کیا مگر ساتھ ہی ساتھ لاطینی زبان کی پہلی رزمیہ نظم (Anneles) بھی لکھی اور اس نظم کے لیے ایک مخصوص بحر (Hexametre) کے استعمال سے لاطینی رزمیہ نظم کی روایت بھی قائم کردی۔ اس نے لاطینی نظم کے ارتقا خصوصاً اس کی تشبیہات اور استعارات اور اس کی زبان کی ترویج کے سلسلے میں بہت اہم کام انجام دیا۔ پلاٹس نے یونانی طربیہ ڈرامہ (Comedy) کو لاطینی جامہ پہنایا۔ اس کے ڈراموں میں ماہرانہ چابکدستی اور عوام کی زبان کو ڈرامے کی ضروریات کے لیے ڈھالنے کی بڑی صلاحیت پائی جاتی ہے۔ اس کے ڈرامے رومی عوام میں ٹیرنس (Terence) کے ڈراموں سے زیادہ مقبول تھے۔ ٹیرنس نے اپنے ڈرامے دوسری صدی قبل مسیح کے پہلے نصف میں لکھے اور وہ نسبتاً زیادہ تعلیم یافتہ اور روشن خیال ناظرین کے لیے لکھے گئے تھے۔ جیسا کہ ہر ادب کی تاریخ کے ابتدائی دور میں ہوتا ہے لاطینی زبان میں بھی نثر سے زیادہ نظم کی طرف توجہ دی گئی اور لاطینی نثر کی نشو و نما پہلی صدی قبل مسیح سے پہلے عمل میں نہیں آئی۔ لاطینی ادیب اب یونانی اساتذہ سے تقریر اور خطابت کا فن سیکھ رہے تھے جس کی جمہوری طرزِ حکومت میں بڑی ضرورت بھی تھی۔ کےٹو (Cato) لاطینی زبان کا پہلا قابلِ لحاظ نثر نگار تھا جس نے لاطینی نثر کو یونانی زبان اور ادب کے غیر معمولی اثر سے نکالنے کی کوشش کی۔ اس عہد کا سب سے بڑا خطیب اور نثر نگار سی سرو (Cicero) تھا جس کے بارے میں عام خیال یہ ہے کہ اس سے بڑا مقرر کسی بھی دور اور کسی بھی زبان نے پیدا نہیں کیا۔ سی سرو کی طرزِ نگارش نہ ہی بہت پیچدار اور تصنع آمیز ہے اور نہ یونانی نثر کی طرح بے رونقی کی حد تک سادہ۔ اس کے خطبوں میں صورت اور معنی کا خوش گوار امتزاج ملتا ہے۔ اس کے طرزِ تحریر نے یورپی زبانوں کے نثری اسلوب پر بہت گہرا اثر چھوڑا ہے۔ اس کی تقریر اور فلسفیانہ تحریر نے لاطینی نثر کے معیار معین کر دیے جن پر صدیوں عمل ہوتا رہا۔ سی سرو ہی نے مکتوب (Epistle) کو ادبی درجہ دیا۔ لاطینی ادب میں اس صنف کو بڑی اہمیت حاصل ہوئی۔ اسی دور میں تاریخ نویسی کے فن نے بھی ترقی کی اور اس میدان میں مشہور جنرل اور حکمراں جولیس سیزر نے خاص مقام حاصل کیا۔ لاطینی شاعری نے بھی یونانی شاعروں کی نقالی کے بجائے نئی راہیں اختیار کیں اور اس دور کے دو بڑے شاعر لوکری شیس (Lucretius) اور کےٹیلس (Catullus) ہیں۔ لوکری شیس کا شاہکار اس کی معرکتہ الآرا نظم "نظم کائنات" (De Razum Natura) ہے جس میں اپی کیورین (Epicurian) فلسفۂ حیات کو ادبی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔ اسے بجاطور پر مغربی دنیا کی سب سے عظیم فلسفیانہ نظم کہا جاتا ہے کیونکہ اس میں شاعری اور فکر کا بہت ہی کامیاب امتزاج ملتا ہے۔ لوکری شیس کا کمال یہ ہے کہ اس نے ایک غیر شاعرانہ موضوع کو بے حد شاعرانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ کےٹیلس نے یونانی شاعری کی کئی بحروں کو لاطینی نظم میں ڈھالا اور لاطینی شاعری کو ہیئت اور فن دونوں لحاظ سے بہت آگے بڑھایا۔

لاطینی ادب کے سنہری دور (Golden Age) کی ابتدا خانہ جنگیوں،

کے طویل سلسلے کے اختتام کے ساتھ ہوتی ہے۔ آکٹے ویس سیزر (Octavius Ceeser) نے جوآگسٹس (Augustus) کے تاریخی نام سے زیادہ مشہور ہے۔ خانہ جنگی میں اپنی کامیابی کے بعد اپنی شہنشاہی کا اعلان کیا جس کے نتیجے میں مطلق العنانی نے دورِ جمہوریت کی جگہ لے لی۔ امن و امان شاندار ماضی کے احساس اور اس سے بھی زیادہ شاندار مستقبل کی امید، توسیع اقتدار مملکت، ان سب باتوں نے ادب کے لیے ایسی سازگار فضا مہیا کی کہ ایک مختصر سی مدت میں کئی ادبی کارنامے انجام پائے۔ آگسٹس اور اس کے قریبی رفقا خصوصاً مے سی نس (Maecenas) نے ادب کی سرپرستی اپنے ذمے لے لی اور ایسے عظیم شاعروں اور ادیبوں کو اپنے اطراف جمع کیا کہ دنیا کی تاریخ میں اس کی مثال مشکل ہی سے ملے گی۔ ان سب میں پہلا مقام بلاشبہ ورجل (Vergil)یا (Virgil) کو حاصل ہے جسے اپنی رزمیہ نظم ای نی ایڈ (The Aeneid) کی بدولت شہرتِ دوام ملی۔ اس نے کئی اور اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی اور ہر ایک میں ممتاز مقام حاصل کیا۔ اس کی پہلی بڑی نظم Eclogues ہے جس میں دیہاتی زندگی کی بڑے ہی شاعرانہ پیرایہ میں عکاسی کی گئی ہے۔ اس صنف کو جسے انگریزی میں Pastoral کہا جاتا ہے رومی شاعروں نے یونانی سے حاصل کیا اور ورجل کی نظم کی کامیابی نے اسے یورپی شاعری کی مستقل صنف بنا دیا جس میں ہر زبان کے تقریباً ہر بڑے شاعر نے طبع آزمائی کی ہے۔ ورجل کی دوسری بڑی نظم Georgics ہے جسے اس نے آگسٹس سیزر کی زرعی اصلاحات کی حمایت میں لکھا تھا۔ بظاہر یہ پروپیگنڈہ کی شاعری ہے لیکن اپنی فنی خوبیوں اور دیہاتی زندگی کی خوبصورت نقاشی کے سبب یہ شعری دل کشی اور اہمیت کی حامل ہے۔ ورجل کی مشہور نظم ای نی ایڈ بھی جو اس کی ادبی زندگی کا حاصل ہے۔ ایک لحاظ سے ایک مقصدی نظم ہے کیونکہ یہ بھی شاید شہنشاہ کی ایما پر لکھی گئی تھی اور اس کا اصل منشا یہ تھا کہ رومن قوم کے شاندار ماضی کو حکایتی انداز میں بیان کیا جائے اور آگسٹس کا سلسلۂ نسب دیوی دیوتاؤں سے ملایا جائے تاکہ اسے الوہیت کا درجہ ملے۔ ان مقاصد سے قطع نظر ای نی ایڈ (The Aeneid) دنیا کی عظیم ترین نظموں میں سے ایک ہے۔ ورجل نے ہومر کی دونوں رزمیہ نظموں ای لیاڈ (The Iliad) اور اوڈے سی (The Odyssey) کی خصوصیات کو اپنی نظم میں یکجا کر دیا ہے لیکن ورجل کے کارنامے کی نوعیت اکتسابی نہیں ہے۔ اس نظم کی فنی خوبیاں اس کے شاعرانہ خدوخال، اس کی جذبات نگاری، اس کی منظر کشی، اس کی تخیلانہ اڑان اور اس کے فلسفیانہ رنگ نے اسے بجا طور پر اپنی صنف کا شاہکار بنا دیا ہے۔ اسی وجہ سے ورجل کی شاعری بعد کے شاعروں کے لیے مشعلِ راہ بن گئی۔ صحیح تو یہ ہے کہ یورپی رزمیہ (Epic) کی تاریخ میں ورجل کو وہ مقام حاصل ہے جو ہومر کو بھی نہیں دیا جا سکتا۔ ورجل نے اس نظم پر اپنی ساری توانائی اور قدرتِ کلام صرف کر دی پھر بھی اپنی موت کے وقت اس نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ نظم کے مسودہ کو جلا دیا جائے کیونکہ وہ اس سے پورے طور پر مطمئن نہیں تھا اور اسے بے عیب بنانا چاہتا تھا۔ لاطینی ادب میں یہ وہ دور تھا جب کہ فنی عظمت بذاتِ خود ایک نصب العین تھی۔ اس زمانے کے دوسرے شاعروں ٹی بی لس (Tibullus) اور پراپرشیس (Propertius) نے مرثیہ نگاری میں نام پیدا کیا۔ کئی بحروں میں اختراعات کیں اور تنوع کو راہ دی۔ اووڈ (Ovid) نے ان بحروں کا نہایت کامیابی کے ساتھ اپنی رومانی اور جذباتی شاعری میں استعمال کیا اور ان نظموں میں بھی جو اس نے جلاوطنی کے دور میں لکھی تھیں۔ اووڈ کی سب سے مشہور نظم Metomorphoses ہے جس میں اس نے تخیل کی غیر معمولی اڑان اور نئے الفاظ اور محاورات کو ایجاد کرنے کی صلاحیت کا اظہار کیا ہے۔ کہانیوں کے اس مجموعے نے یورپی ادب کو روایتوں اور استعاروں کا ایک بیش بہا ذخیرہ دیا ہے۔ مگر بحیثیت شاعر ہورلیس (Horace) کا مقام اووڈ سے کہیں بڑھا ہوا ہے۔ فن کا جو کمال اور جوز اکتِ بیان ہمیں ہورلیس کی شاعری خصوصاً اس کے Odes میں ملتی ہے وہ بہت کم شاعروں کو نصیب ہوئی ہے۔ یہ مختصر نظمیں مختلف بحروں میں لکھی گئی ہیں اور ان کے موضوعات میں بہت تنوع پایا جاتا ہے۔ حب الوطنی، شاہ پرستی، محبت و دوستی، رندی وقلندری، سنجیدگی اور کھلنڈرے پن کی یکجائی پر لکھی ہوئی یہ نظمیں نہ صرف اس لحاظ سے اہمیت رکھتی ہیں کہ اس میں فن کی پختگی اور اختصارِ بیان کی خوبیاں بدرجۂ اتم پائی جاتی ہیں بلکہ اس لیے بھی کہ رومی مزاج اور افتادِ طبع کی اس سے بہتر تصویر ہمیں کہیں اور نہیں مل سکتی۔ Satires اور Epistles میں ہورلیس نے اپنی شخصیت کے اظہار کے ساتھ ساتھ انسانی خوبیوں اور خامیوں کو فلسفیانہ رنگ میں پیش کیا ہے۔ ہورلیس کا ایک اور کارنامہ اس کی نظم Ars Poetica ہے جو فنِ تنقید پر نظم میں لکھی جانے والی پہلی تالیف ہے اور جہاں کلاسیکی اصولِ نقد و نظر یکجا کر دیے گئے ہیں۔

پہلی اور دوسری صدی عیسوی میں ادبی ذوق اور معیارات میں تصنع کا عنصر غالب آنے لگا اور اس کا اثر نثر سے زیادہ نظم پر پڑا۔ اس دور کی لاطینی نثر بڑی جاندار اور فصیح ہے اور اس کے بہترین نمائندے لیوی (Livy) کینٹی لین (Quntillian) پلینی (Pliny) اور ٹیسی ٹس (Tacitus) ہیں، آخرالذکر مورخ تھا جس کی کتاب Annals تاریخ نویسی کا شاہکار سمجھی جاتی ہے۔ اس دور کی شاعری میں فنِ تقریر کی گھن گرج شامل ہوگئی جس کا سب سے بہتر نمونہ جووے نل (Juvenal) کی طنزیہ شاعری ہے۔ اس شاعر نے طنز نگاری میں بڑا مقام حاصل کیا اور اس صنف میں اس کا درجہ ہورلیس سے بھی اونچا سمجھا

جاتا ہے۔ یورپی زبانوں کی طرح یہ شاعری زیادہ تر جودے نیل ہی سے زیادہ متاثر ہوئی ہے۔ اسی زمانے میں ورجل کے کئی پیروشاعروں نے اس کے رنگ میں شاعری کرنے کی کوشش کی لیکن وہ ورجل کی گرد کو بھی نہ پہنچ سکے۔ سینیکا (Seneca) کے المیہ ڈرامے (Tragedies) لاطینی ادب کے دور سیمیں کی سب ہی خرابیوں کے حامل ہیں۔ اس کے باوجود ان ڈراموں کے چند عنصر یورپی ڈرامے کا جزو لاینفک بن گئے۔ پلینی (Pliny) کی کتاب Natural History میں کئی ادبی خوبیاں پائی جاتی ہیں اور یہ کتاب کئی صدیوں تک علوم فطری پر ایک معیاری کتاب سمجھی جاتی رہی، گوکہ اس میں سائنس کم ہے اور داستان طرازی زیادہ۔ جودے نیل کے بعد لاطینی شاعری نے اپنی فطری تازگی کھودی اور اس میں انحطاط کے پورے آثار پیدا ہوگئے۔ مسیحی مذہب کے عروج نے لاطینی زبان میں ایک بڑا ادیب پیدا کیا، وہ تھا سینٹ آگسٹین (St. Augustine) جس کی کتاب Confessions اس زمانے کی لاطینی نثر کا شاہکار سمجھی جاتی ہے اور بحیثیت آپ بیتی اس کا شمار دنیا کی مشہور کتابوں میں ہوتا ہے۔

گو قرون وسطیٰ نشاۃ ثانیہ (Renaissance) کے دور اور اس کے بعد بھی تقریباً سترھویں صدی اور اٹھارھویں صدی عیسوی تک یورپی ادیب اور شاعر لاطینی زبان کو اپنی ادبی تخلیقات کے لیے استعمال کرتے رہے لیکن ان میں کوئی بھی صف اول کا شاعر یا ادیب نہیں ہے جن کا مقابلہ دور زریں یا دور سیمیں کے لکھنے والوں سے کیا جاسکے۔ اور لاطینی زبان کا استعمال بتدریج چند مذہبی اور علمی ضروریات کی تکمیل کی حد تک سمٹ کر رہ گیا۔

لاطینی زبان اور ادب نے مغربی یورپ کی زبانوں اور ان کے ادب پر زبردست اثر ڈالا ہے۔ یہاں ایک بات قابل لحاظ یہ ہے کہ لاطینی ادب کی اکتسابی نوعیت پر ضرورت سے زیادہ زور دینا اس کے ساتھ ناانصافی کے مترادف ہے کیوں کہ اس ادب کی کئی عظیم خصوصیات ہیں جو اس کی اپنی ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ لاطینی ادب نے زیادہ تر یونانی ادب کی پیروی کی ہے اور یونانی اصناف سخن کو آگے بڑھایا ہے اور اس میں بظاہر قوت ایجاد کی کمی دکھائی دیتی ہے۔ لیکن یہ بات ذہن نشیں رکھنے کے لائق ہے کہ لاطینی ادیبوں نے ان اصناف سخن کو کچھ اس طرح سے اپنا لیا کہ صرف اسے نقالی کا نام نہیں دیا جاسکتا بلکہ ایک نئی شان اور ایک نیا انداز پیدا ہوا۔ لاطینی تہذیب بڑی حد تک سیکولر تھی اور یہی صفت لاطینی ادب کی امتیازی خصوصیت بھی ہے۔ ان سب سے بڑھ کر جو چیز لاطینی ادب کو عظمت بخشتی ہے وہ لاطینی زبان کی دین ہے۔ لاطینی زبان بڑی ہی پُرشکوہ اور باوقار زبان ہے اور اس کی جامعیت اور سلاست نے اسے ادبی مطالب کے اظہار کا نہایت کامیاب ذریعہ بنا دیا ہے۔ لاطینی ادب میں لاطینی قوم کی سیاسی و معاشرتی تہذیب کی بڑی کامیاب عکاسی ملتی ہے۔ مغربی یورپ کی زبانوں اور ادب کے ارتقا میں لاطینی نے یونانی زبان و ادب سے بھی زیادہ کام کیا ہے۔ رومانس (Romance) زبانیں — اطالوی، فرانسیسی، پرتگیزی اور ہسپانوی — تو براہ راست لاطینی ہی سے نکلی ہیں۔ انگریزی زبان اور ادب پر بھی لاطینی زبان و ادب کی بڑی گہری چھاپ ہے۔

□□□

اردو زبان کی تدریس

معین الدین

اردو کیسے پڑھی اور پڑھائی جائے درس و تدریس کے جدید سائنٹفک اصولوں کی روشنی میں تدریسی طریقۂ کار کا تعین طلبہ اور اساتذہ دونوں کے لیے یکساں مفید۔

پانچواں ایڈیشن

صفحات: 148 ، قیمت: 29.00 روپے

ہندستان کا شاندار ماضی

مصنف: اے ایل باشم
مترجم: سید غلام سمنانی

ہندستان کے قدیم تہذیب و تمدن کا مفصل اور مکمل تعارف مستند تاریخی شواہد کی روشنی میں

دوسرا ایڈیشن

صفحات: 748 ، قیمت: 145.00 روپے

اتر پردیش کے لوک گیت

اظہر علی فاروقی

ہمارے لوک گیتوں میں ہندستان کی عوامی زندگی کی بھرپور ترجمانی ہوئی ہے۔ اس کتاب میں اظہر علی فاروقی نے اتر پردیش کے وہ تمام گیت یکجا کر دیے ہیں جو مختلف موقعوں پر عوام کے دکھ سکھ کی ترجمانی کرتے ہیں

صفحات: 652 ، قیمت: 120.00 روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر۔کے۔ پورم، نئی دہلی-110066

سلمان عابد

کیریئر گائیڈنس

آرمی میں بہ حیثیت مذہبی استاد کیریئر

آج ہمیں ایسا کیریئر منتخب کرنا چاہیے جو نہ صرف ہمیں فائدہ پہنچائے بلکہ ہماری نسل کے لیے بھی فائدہ بخش ہو، ان کی تعلیم، روزگار اور بہ حیثیت مجموعی کیریئر سازی میں۔ ایسا کیریئر دفاعی خدمات (Defence Services) میں ہے اور ان خدمات میں عام طور سے بارہویں جماعت PCB/PCM کامیاب طلبہ شریک ہو سکتے ہیں۔ ان کے علاوہ مختلف پیشہ ورانہ کورسیز میں کامیابی کے بعد بھی شریک خدمات ہوا جا سکتا ہے مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسے طلبہ کیا کریں جنھوں نے آرٹس گروپ سے یا اردو یا عربی سے کورس کر لیا ہے؟ جواب یہ ہے کہ ایسے طلبہ اور ایسے افراد بھی فوج میں اپنا کیریئر بنا سکتے ہیں۔ ان کے لیے دو راستے ہیں۔ پہلا یہ کہ بہ حیثیت مذہبی استاد شریک خدمات ہو جائیں یا پھر ٹیری ٹوریل آرمی میں آرمی آفیسر کی حیثیت سے شامل ہو جائیں۔ اس کے لیے کوئی بھی ہندستانی شہری اہل ہے چاہے وہ سرکاری ملازم کیوں نہ ہو۔

تعلیمی اہلیت: ہندستانی ہو، 27 سے 34 سال کے اندر عمر ہو، کسی بھی یونیورسٹی سے کسی بھی ڈسپلن میں گریجویٹ ہو، جنھوں نے بی اے ہندی یا سنسکرت سے کیا ہو، وہ بھی اہل ہیں اور یہ پنڈت کے لیے درخواست گزار ہو سکتے ہیں۔ مولوی کے عہدے پر تقرر کے لیے چاہیے کہ کسی بھی مسلمہ یونیورسٹی سے بی اے عربی یا اردو سے کیا ہو، یا مذہبی ادارے سے مماثل تعلیمی قابلیت رکھتا ہو یا پھر کم از کم گریجویشن کی سطح پر اردو/عربی بہ حیثیت ایک مضمون پڑھا ہو۔ اس کے لیے صرف لڑکے ہی اہل ہیں۔

طبی اہلیت: طبی لحاظ سے پوری طرح صحت مند ہوں، دماغی و جسمانی اعتبار سے صحت مند ہوں، گونگے، بہرے نہ ہوں، فطری دانت ہوں، دانتوں سے متعلق، ہڈیوں سے متعلق یا جسمانی اعضا بیمار نہ ہوں، قد کم از کم 155 سینٹی میٹر ہو، وزن کم از کم 50 کلو ہو، سینہ 77 سینٹی میٹر ہو، اور جسمانی طور پر اسی طالب علم کو تندرست مانا جائے گا جو آٹھ منٹ میں ایک میل دوڑ سکتا ہو۔

طریقۂ انتخاب: اس کے لیے مختلف زبانوں کے ممتاز روزناموں میں اشتہار دیا جاتا ہے۔ درخواستیں طلب کی جاتی ہیں۔ استاد کی تنقیح اور طبی جانچ کے بعد تحریری امتحان اور اس میں کامیابی کے بعد انٹرویو کیا جاتا ہے۔ فائنل سلیکشن ایک بورڈ کی جانب سے کیا جاتا ہے۔ ان مراحل میں کامیابی کے بعد جونیئر کمشنر آفیسر (Religious Teacher) کی طرح تقرر کیا جاتا ہے۔ پھر چھ ہفتوں کی تربیت دی جاتی ہے۔ ساتھ میں 10 ہفتوں کی ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ آف نیشنل انٹگریشن، پونے میں فراہم کی جاتی ہے۔ انٹرویو کے لیے آنے والے امیدواروں کا سفرخرچ ادا کیا جاتا ہے۔

تقرر: اس ٹریننگ میں کامیابی کے بعد کمشنر مذہبی استاد مقرر کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد انھیں ترقی کے مواقع بھی ہوتے ہیں اور یہ 10 سال کی سروس کی تکمیل کے بعد صوبے دار/رسالدار بنائے جاتے ہیں۔ ان کا اوّل اوّل پے اسکیل 5620-140-8140 روپے ہوتا ہے۔ ساتھ میں اضافی ڈی اے ہوتا ہے۔

سہولیتں: انھیں کئی سہولتیں مفت میں حاصل ہیں، جیسے رہائش، فری راشن، یونیفارم اور میڈیکل فری ہوتا ہے اور اپنے خاندان کے ساتھ رعایتی ٹکٹ پر سفری سہولتیں بھی مہیا ہیں۔ ان سب کے علاوہ ایک عام فوجی کو جو سہولتیں اور رعایتیں فراہم ہیں وہ تمام انھیں بھی حاصل ہیں۔

تحریری امتحان: اس تقرر کے لیے تحریری امتحان دو پرچوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ پہلا پرچہ 250 نمبروں پر مبنی ہوتا ہے۔ جس میں عام معلومات (general knowledge) کے سوالات ہوتے ہیں۔ یہ پرچہ انگریزی یا ہندی میں حل کیا جا سکتا ہے۔ پہلا پرچہ تمام مذہبی استاد، پنڈت، مولوی، بدھسٹ، گرنتھی وغیرہ کے لیے لازمی ہے۔ البتہ 250 نمبروں پر مشتمل دوسرا پرچہ اس مضمون سے متعلق ہوگا جس مضمون کے لیے امیدوار نے درخواست دی ہے۔ یہ پرچہ امیدوار اپنی مرضی سے انگریزی یا ہندی زبان میں حل کر سکتے ہیں۔

سبکدوشی: ان تمام مراحل سے گزر کر جب تقرر ہو جاتا ہے اور ترقی پا کر نائب صوبے دار یا صوبے دار ہو جاتے ہیں تو 55 سال کی عمر میں سبکدوش کر دیا جاتا ہے۔ اگر صوبے دار میجر کی طرح ترقی ملی ہو تو 4 سال اس عہدے پر مکمل کر لیے جانے کے بعد یا 55 سال کی عمر مکمل ہونے کے بعد سبکدوش کر دیا جاتا ہے۔

درخواست: عام طور سے درخواست اکتوبر کے مہینے میں طلب کی جاتی ہے۔ ملک کے ممتاز اخبارات اور ہفتہ وار روزگار سماچار (اردو، انگریزی، ہندی) میں نمونہ درخواست فارم شائع کیا جاتا ہے جس کی ہو بہو کمپیوٹرائز ڈنقل لے کر فارم کی خانہ پری کی جا سکتی ہے (اگر یہ سارا عمل مشکل ہو تو کسی بھی وقت اپنی تفصیلات کے ساتھ مجھے خط لکھ دیں جب بھی درخواست طلب کی جائے گی میں ساری تفصیلات اور درخواست فارم مفت فراہم کر دوں گا۔)

پتہ: مکمل خانہ پری کے بعد درخواستیں جمع کرنے کا پتہ درج ذیل ہے۔

1. INDEP.RTG OFFICE, DELHI CANTT-10
2. HQ RTG ZONE, 236, M.G. ROAD, LUCKNOW CANTT-226002
3. HQ RTG ZONE, 148, FD MARSHAL, K.M. KARIAPPA ROAD, BANGALORE-560025
4. HQ RTG, ZONE, 1-GOKHLE ROAD, KOLKATA-700020
5. J&K LI REGT. TRG CENTRE, C10 56 APO (SRINAGAR)

آرمی میں بھرتی کا دوسرا سنہرا موقع 42 سال تک کسی بھی فرد کو حاصل ہے۔ Territorial Army میں بہ حیثیت آفیسر تقرر پانے کے لیے کوئی بھی ہندستانی شہری (صرف مرد) جو طبی اعتبار سے صحت مند ہو اور کسی بھی یونیورسٹی سے گریجویٹ ہو، درخواست گزاری کا اہل ہے۔ عمر 18 سے 42 سال کے درمیان ہو، Ex-service officers بھی اپلائی کر سکتے ہیں۔ سلیکشن کے بعد ایک ماہ کی تربیت فراہم کی جاتی ہے۔ اس کے بعد ہر سال صرف دو ماہ کا سالانہ ٹریننگ کیمپ منعقد کیا جاتا ہے جس میں انھیں شرکت کرنی ہوتی ہے۔ اس کے بعد تقرر کے دو سال تک 75 دنوں کی تربیت علاحدہ فراہم کی جاتی ہے۔ اس کے بعد جب بھی ضرورت ہو، انھیں خدمت کے لیے استفادے کی خاطر طلب کیا جاتا ہے۔ عام طور سے درخواست اکتوبر/نومبر میں طلب کی جاتی ہے۔ اگر عام شہری ہوں تو درخواست فارم اور مکمل تفصیلات اس پتے سے طلب کی جاسکتی ہیں جس کے لیے متعلقہ TA GROUP COMMANDER کے نام 10 روپے کا پوسٹل آرڈر اور 12 روپے کا ڈاک ٹکٹ لگا خود کا پتہ لکھا لفافہ (28x12 سینٹی میٹر) روانہ کیا جانا چاہیے۔

جموں وکشمیر، ہماچل پردیش، ہریانہ، پنجاب، دہلی اور چنڈی گڑھ سے تعلق رکھنے والے عام شہری اس پتے سے درخواست طلب کر سکتے ہیں۔

COMMANDER
TA GROUP HEAD QUARTERS, WESTERN COMMAND,
BUILDING NO:750-SECTOR-8B,
CHANDIGARH-160018

اترپردیش، بہار، اڑیسہ اور مدھیہ پردیش کے امیدوار اس پتے پر درخواست کے لیے لکھیں۔

COMMANDER,
TA GROUP HQRTRS, CENTRAL COMMAND,
LUCKNOW-2.

راجستھان، مہاراشٹر، کرناٹک، کیرالہ، گجرات، تامل ناڈو، آندھرا پردیش، گوا، پانڈیچری وغیرہ سے تعلق رکھنے والے امیدوار اس پتے پر رابطہ کریں۔

COMMANDER
TA GROUP HEAD QUARTERS, SOUTHERN COMMAND, PUNE-1

مغربی بنگال، آسام، منی پور، تریپورہ، ناگالینڈ، میزورم، میگھالیہ، سکم اور اروناچل پردیش کے عام امیدوار درخواست طلبی کے لیے اس پتے پر رجوع کریں۔

COMMANDER
TA GROUP HEAD QUARTERS, EASTERN COMMAND, KOLKATA-21

اس آرمی کا سب سے اہم فائدہ یہ ہے کہ سرکاری ملازمین بھی آرمی میں بھرتی کی اپنی خواہش پوری کر سکتے ہیں۔ جو خود روزگار، کاروبار یا تجارت سے جڑے ہوئے ہیں، وہ بھی اپنا کاروبار جاری رکھتے ہوئے آرمی میں بھرتی ہوکر نہ صرف تمام تر فوجی سہولتوں اور رعایتوں سے فائدہ حاصل کر سکتے ہیں بلکہ دیگر لوگوں کو بھی فائدہ پہنچا سکتے ہیں۔ Ex-service officers درخواست فارم کے لیے اس پتے پر رابطہ کر سکتے ہیں۔ اس کے لیے ADG, TA, ARMY HEAD QUARTERS, کے نام 10 روپے کا پوسٹل آرڈر اور اپنا بایوڈاٹا روانہ کرنا ہوگا۔ ساتھ میں 12 روپے کا ڈاک ٹکٹ لگا خود کا پتہ لکھا لفافہ بھی ہو (28x12 سینٹی میٹر۔) فارم اس پتے سے حاصل اور داخل کرنا ہوگا۔

ADDITIONAL DIRECTORATE GENERAL,
T.A., ARMY HEAD QUARTERS, L BLOCK,
NEW DELHI-110001

اس ضمن میں جو بھی امیدوار مذکورہ شرائط کی تکمیل کرتے ہوں اور درخواست داخل کرنے کی حقیقی خواہش رکھتے ہوں ان کی مناسب، موزوں اور حقیقی مفت رہنمائی کے لیے کئی فلاحی ادارے ملک میں کام کر رہے ہیں۔ کئی کیریئر گائیڈنس سینٹرز ملک کے مختلف مقامات، مختلف تعلیمی اداروں اور جامعات میں کام کر رہے ہیں۔ ان میں چند ایک واقعی ہمدرد اور انسانی وسائل کی بہتر تربیت اور بہتر صلاحیت کے لیے بہترین رہنمائی میں بے مثال ہیں۔ یہ ساری خدمات مفت ہیں۔ جنوبی ہند کے طلبہ سہولت کی خاطر مجھے لکھ سکتے ہیں اور شمالی ہند سے تعلق رکھنے والے امیدوار میرے علاوہ اس پتے سے بھی مکمل اور کارگر رہنمائی وتعاون حاصل کر سکتے ہیں۔

1. DR. PERVAIZ TALIB
   DIRECTOR
   COACHING & GUIDANCE-CENTRE
   ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY
   ALIGARH-202002-TEL:0571-2701760
   directorgcamu@yahoo.co.in
2. drsalman786@yahoo.cm
   98491 54810/040-24745337/040-55135336

161, Special C, Nehru Nagar, Kachiguda,
Hyderabad-500027

□□□

نعیم احسن

ساتویں قسط

اِنٹرنیٹ گائیڈ

انٹرنیٹ سے مواد حاصل کرنا

بہت سے انفرادی لوگوں اور کمپنیوں نے ایسے سائٹ بنائے ہیں جو ویب پر انفارمیشن تلاش کرنے میں معاونت کرتے ہیں۔ ویب کے لیے نہ تو کوئی کلیر پاتھ (Path) ہے اور نہ ہی کوئی ایسا سیدھا راستہ کہ بغیر کوئی ایڈریس جانے کسی چیز کو پالیں۔ یعنی ویب کی تلاش کے لیے کوئی واحد اور مخصوص طریقہ نہیں ہے لیکن پھر بھی مختلف طریقوں کا استعمال بعض اوقات بہت مفید ثابت ہوتا ہے۔ ذیل میں ہم انھی مختلف طریقوں کا جائزہ لیتے ہیں۔

ویب تلاش کرنا

ویب پر بڑی تعداد میں ایسے پیج ملتے ہیں جو مخصوص انفارمیشن تلاش کرنے کے لیے آپ کو دو ماڈل فراہم کرتے ہیں۔ ایک ماڈل تو ''ڈائرکٹری'' جہاں ویب سائٹس کی ترتیب و تنظیم/ موضوعات اور ذیلی موضوعات کے ذریعے کی گئی ہوتی ہے۔ (اس کا طریقہ Yellow Pages کی ٹیلی فون ڈائرکٹری سے ملتا جلتا ہے) دوسرا ماڈل کامل تلاش انڈکس ہے جس میں آپ کوئی کلیدی لفظ تلاش کرنے کے لیے درج کرتے ہیں اور ''سرچ پیج'' مجوزہ سائٹس کی ایک لسٹ فراہم کرتا ہے۔ جو مطلوبہ چیز سے ملتی جلتی ہوگی۔ اب دونوں طریقوں کو ذرا تفصیل سے دیکھتے ہیں۔

ڈائرکٹری کے ذریعے تلاش کا عمل

ویب پر ایک بہترین ڈائرکٹری یا ہو (Yahoo) سائٹ ہے۔ اس کو دیکھنے کے لیے ایڈریس اس طرح ہے:

http://www.yahoo.com

یہ ایڈریس ویب براؤزر کے اوپر والے حصے میں ایڈریس باکس کے اندر ٹائپ کریں۔ اگر اس کو آپ بار بار استعمال کرنا چاہیں تو اسے بک مارک بنالیں یا فیورٹس لسٹ (Favorites List) میں شامل کرلیں۔ بعد ازاں آپ کے پروگرام پر منحصر ہے کہ مطلوبہ عمل کے لیے آپ کو کس کمانڈ کا انتخاب کرنا پڑتا ہے۔

موضوع (Topic) کے ذریعے تلاش کا عمل

''Yahoo'' کو اس طرح ترتیب دیا گیا ہے کہ ایک شجرہ (Tree) کی صورت میں استعمال ہوسکتا ہے یعنی آپ ایک جنرل ٹاپک سے شروع کرسکتے ہیں اور اس کے تحت مخصوص ٹاپک آپ کو ملتے جاتے ہیں۔ ہر موضوع کے نیچے اس کے ذیلی موضوعات بھی دیے گئے ہیں۔ ''یاہو'' میں کیٹگری لسٹیں بولڈ ٹائپ میں ہیں۔ ان سے آگے ذیلی موضوعات کا انتخاب کیا جاسکتا ہے جب کہ اختتامی اندراجات، جن کے تحت مزید موضوعات دستیاب نہیں ہوتے، سادہ ٹیکسٹ (Text) میں ظاہر ہوتے ہیں۔

کلیدی لفظ (Keyword) کے ذریعے تلاش کا عمل

ہمیشہ اس بات کا اندازہ لگا لینا آسان نہیں ہے کہ کون سا پیج یا ٹاپک ''Yahoo'' جیسے پروگراموں کے منظم ڈھانچہ کی لسٹ میں کہاں واقع ہے۔ خوش قسمتی سے اس سائٹ میں ہر پیج کے اوپر ایک ''سرچ فیچر'' بھی دستیاب ہے۔

تلاش کا عمل کرنے کے لیے ایک یا ایک سے زائد لفظ ٹائپ کریں۔ یہ الفاظ پیج کے اوپر والے حصے میں سرچ باکس کے اندر ٹائپ کیے جاتے ہیں، ٹائپ کرنے کے بعد Search بٹن پر کلک کردیں۔

سرچ انجن کے ذریعے تلاش کا عمل

سرچ انجن سے مراد وہ ویب سائٹ ہیں جو نیٹ پر تلاش کے عمل کے لیے ڈیزائن کیے جاتے ہیں۔ بہت سے سرچ انجن بہت ہی مخصوص اور بعض اوقات بہت ہی پیچیدہ استفسارات تلاش کرنے کی اجازت دیتے ہیں، بڑی حد تک اس طرح کہ ایک ڈاٹا بیس پروگرام سمٹ (Submit) کرسکتے ہیں لیکن عمومی قسم کی تلاش کے لیے آپ کو ان ایڈوانس فیچرز کی ضرورت نہیں ہے اس کے بجائے ایک واحد کلیدی لفظ یا دو لفظوں کے اندراج سے بھی آپ کام لے سکتے ہیں۔ سرچ انجن عام طور پر تلاش کرنے والے سائٹس کی بہ نسبت زیادہ وسیع تناظر میں نتائج فراہم کرتے ہیں۔

ایک مقبول عام سرچ انجن لائیکوس (Lycos) ہے۔ لائیکوس آپ کو اس ایڈریس پر دستیاب ہے:

http://www.lycos.com

اس کے علاوہ ایک اور مقبول سرچ انجن آلٹاوسٹا (Alta Vista) ہے اس کا ایڈریس اس طرح ہے:

http://www.altavista.digital.com

سنٹرل سرچ پیج کو دیکھنا

زیادہ تر ویب براؤزر ایسے ہیں جو ایک یا زائد ڈائرکٹریوں میں پیج کی تلاش کے لیے آپ کو شارٹ کٹ فراہم کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ Lynx جو کہ ایک کیریکٹر بیس لِنکس براؤزر ہے آپ کو شارٹ کٹ مہیا کرتا ہے اس میں ڈائرکٹری سائٹ پر جانے کے لیے آپ صرف / ٹائپ کرتے ہیں۔

نیٹ اسکیپ نیوی گیٹر میں آپ کو ڈائرکٹری بٹن بار پر دو بٹن دستیاب ہیں۔ 1- نیٹ ڈائرکٹری اور 2- نیٹ سرچ۔ اس کے لیے آپ کسی ایک پر کلک کرکے براہ راست نیٹ اسکیپ کے ذاتی ''سنٹرل سرچ پیج'' پر جاسکتے

ہیں۔ مذکورہ بالا بٹن آپ اپنی مرضی سے اسکرین پر ظاہر یا ان کو اسکرین پر سے غائب کرسکتے ہیں اس کے لیے:

I- مین مینو میں Options پر کلک کریں۔

II- اس کے تحت Show Dir Buttons کمانڈ پر کلک کریں۔

اس کے علاوہ بٹنوں کی بجائے مینو بار کے ذریعے بھی یہ عمل کیا جاسکتا ہے۔ اس کے لیے:

I- مین مینو میں ''ڈائرکٹری'' کمانڈ پر کلک کریں۔

II- اس کے تحت ''انٹرنیٹ ڈائرکٹری'' پر کلک کریں۔

III- اور پھر ''انٹرنیٹ سرچ'' کا انتخاب کریں۔

کسی بھی دوسری ڈائرکٹری یا سرچ پیج کی طرح اس میں بھی Excite ٹیکسٹ باکس میں تلاش کیا جانے والا ایک یا زائد لفظ ٹائپ کریں اور ''سرچ'' بٹن پر کلک کریں یا پھر کیٹگری کا انتخاب کریں اور براؤزنگ شروع کردیں۔

اسکرول ڈاؤن کرکے آپ Excite کی Choose a Category کو دیکھ سکتے ہیں۔ اس میں آپ کو اچھے ڈائرکٹری سائٹس بشمول ''یاہو'' کی لسٹ ملتی ہے۔ اس پیج کے لیے بک مارک کی ضرورت نہیں ہے اگر آپ نیٹ اسکیپ استعمال کررہے ہیں کیوں کہ اس میں پہلے سے تیار شارٹ کٹ موجود ہے لیکن اگر آپ کوئی اور براؤزر استعمال کررہے ہیں تو اس ایڈریس پر جائیں۔

http://home.netscape.com/home/internet-directory.html

اور ایک بک مارک بنالیں جو وقتِ ضرورت واپسی کی صورت میں آپ کو آسانی فراہم کرے گا۔

اگر آپ وسیع تناظر میں تلاش کا عمل کرنا چاہتے ہیں تو:

I- مین مینو میں ''ڈائرکٹری'' پر کلک کریں۔

II- اس کے تحت 'انٹرنیٹ سرچ'' کمانڈ کا انتخاب کریں، نیٹ اسکیپ کا انٹرنیٹ سرچ پیج ظاہر ہوگا۔ اور پھر ''انفوسیک گائیڈ'' باکس میں لفظ ٹائپ کریں جنھیں تلاش کرنا چاہتے ہیں پھر کیٹگری کا انتخاب کرنے اور براؤزنگ شروع کرنے کے لیے ''سرچ'' بٹن پر کلک کریں۔ پیج کے نچلے حصے میں دوسرے اہم سرچ سائٹس کی لسٹ دی گئی ہے اس میں لائیکوس بھی شامل ہے۔ اس پیج کے لیے آپ کو بک مارک کی ضرورت نہیں کیوں کہ اس میں بھی پہلے سے موجود ایک شارٹ کٹ ہے لیکن اگر آپ نیٹ اسکیپ کے بجائے کوئی اور براؤزر استعمال کررہے ہیں تو اوپر دیے گئے ایڈریس پر جاکر آئندہ استعمال کے لیے بک مارک بنالیں۔

چند اہم سرچ ایڈریس

ذیل میں چند اہم سرچ ریسورسیز اور ان کے ایڈریس دیے جارہے ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر آپ کو نیٹ اسکیپ کے نچلے حصے میں دی گئی لسٹ میں دستیاب ہیں۔

RESOURCE	WEB ADDRESS
Search Directories	
A2Z	http://a2z.lycos.com
Amazing Environmental organization WebDirectory	http://www.webdirectory.com
Excite	http://www.excite.com
Magellan	http://www.mckinley.com
Point	http://www.pointcom.com
World Wide Arts Resource	http://www.concourse.com/wwar/default.html
Yahoo	http://www.yahoo.com
Search Engines	
Alta Vista	http://www.altavista.digital.com
Berkeley Public Library's Index to Internet	http://www.ci.berkeley.ca.us:80/bpl/bkmk/index.html
Infoseek	http://www.infoseek.com
Inktomi	http://www.inktomi.berkeley.edu
Lycos	http://www.lycos.com
NlightN	http://www.nlightn.com
Open Text	http://www.opentext.com/omw/fomw.html
shareware.com	http://www.shareware.com
Web Crawler	http://www.webcrawler.com

سوفٹ ویئر اپڈیٹ رکھنے کے لیے فائلیں ڈاؤن لوڈ کرنا

زیادہ تر ویب براؤزر میں ان کا طریقۂ کار ایک جیسا ہی ہے۔ اس میں مطلوبہ سائٹ کو تلاش کرنے، چند لنک استعمال کرنے اور حتمی طور پر اس لنک کو استعمال کرنے جو فائل تک براہِ راست رسائی فراہم کرتی ہے، جیسے عمومی اقدامات شامل ہیں۔

جب آپ یہ اعمال کرتے ہیں تو آپ کا براؤزر یہ جان لیتا ہے کہ آپ کسی ایسی چیز کی خواہش کررہے ہیں جو کہ براؤزر ونڈو میں ظاہر نہیں ہے، لہٰذا وہ ڈاؤن لوڈ کرنے کی پیش کش کرتا ہے یا پھر آپ کے لیے فائل چلانے کی کوشش کرتا ہے اور جب آپ ایک لنک کا انتخاب کرکے فائلیں ڈاؤن لوڈ کرتے ہیں تو نیٹ اسکیپ ایک ڈائیلاگ باکس ظاہر کرتا ہے۔ اس کے بعد درجۂ ذیل امور انجام دیں:

- Save فائل پر کلک کریں۔
- اس کے بعد ظاہر ہونے والے Save As ڈائیلاگ باکس میں فائل محفوظ کرنے کے لیے فولڈر کا انتخاب کریں۔ عام طور پر ایک Temp فولڈر بہتر رہتا ہے کیوں کہ اکثر آپ کو فائلیں کمپریس صورت میں ملتی ہیں جنھیں Unpack کرنا پڑتا ہے یا پھر سوفٹ ویئر ڈاؤن لوڈ کرنے کے لیے حقیقی

سیٹ اپ استعمال کرنا پڑتا ہے۔

● اس کے بعد آپ کا براؤزر فائل کو اس کی پروگریس دکھاتے ہوئے ڈاؤن لوڈ کرنا شروع کردے گا۔ اس کے لیے یا تو خصوصی ڈائیلاگ باکس ظاہر ہوگا یا پھر براؤزر ونڈو کے نچلے دائیں کونے میں اس کی نشاندہی ہوگی۔

انٹرنیٹ سے فائلیں ڈاؤن لوڈ کرنے میں ہمیشہ احتیاط سے کام لیں۔ فائلیں ہمیشہ مستند ذرائع ہی سے ڈاؤن لوڈ کریں کیونکہ اگر آپ اس سلسلے میں احتیاط نہیں کریں گے تو ہوسکتا ہے کہ کسی سوفٹ ویئر کے ذریعے آپ کے کمپیوٹر میں وائرس منتقل ہوجائے جو آپ کے لیے پریشانی کھڑی کردے۔ البتہ اگر آپ فائلیں کسی باضابطہ کمپنی کے ذریعے ڈاؤن لوڈ کررہے ہیں تو پھر زیادہ پریشانی کی ضرورت نہیں ہے۔

انٹرنیٹ پر لوگوں کو تلاش کرنا

اس سلسلے میں چند مفید سائٹس ہیں جن کے ذریعے آپ مطلوبہ لوگوں کو تلاش کرنے کا عمل سرانجام دے سکتے ہیں۔ ذیل میں ہم ان میں سے دو کا ذکر کررہے ہیں:

(1) ہواز (whois) کا استعمال

پہلی جگہ جہاں آپ کسی فرد کو تلاش کرنے کی کوشش کرسکتے ہیں، وہ InterNIC سائٹ پر whois گیٹ وے ہوسکتا ہے۔ InterNIC کا نیٹ ورک انفارمیشن سینٹر ہے۔ یہ اس مقصد کے لیے ایک قابل اعتماد ذریعہ ہے۔ "ہواز" سرچ کا عمل کرنے کے لیے سب سے پہلے براؤزر کو اس طرح پوائنٹ کریں:

http://rs.internic.net/cgi-bin/whois

اس کے بعد فقط ایک نام ٹائپ کریں اور انٹر پریس کردیں۔ جواب کے طور پر whois آپ کو ای میل ایڈریسز اور ڈومین کے ناموں کی ایسی لسٹ فراہم کرے گا جو آپ کے ٹائپ کیے ہوئے الفاظ کے مطابق ہوگی۔ یہ پروگرام بنیادی طور پر ڈومین نام تلاش کرنے کے لیے ہی تیار کیا گیا ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ اس میں تمام انفرادی ایڈریس بھی شامل ہوں۔ تاہم کئی ای میل ایڈریس اس میں ڈاٹا کے طور پر شامل ہیں، اس لیے کوشش کی جاسکتی ہے۔

(2) ہوویئر (Who Where) کا استعمال

یہ ایک اور اچھا سائٹ ہے جسے آپ ای میل ایڈریسز دیکھنے کے لیے استعمال کرسکتے ہیں اور اس کے لیے براؤزر کو اس طرح پوائنٹ کریں:

http://www.whowhere.com

اس کے بعد Name of the person کے خانے میں نام ٹائپ کریں۔ اگر آپ کسی ایسی آرگنائزیشن کو جانتے ہیں جس کی لسٹ میں آپ کا مطلوبہ آدمی شامل ہے تو دوسرے خانے میں (یہ اختیاری (Optionlal) ہے) آرگنائزیشن کا نام ٹائپ کریں۔ اس کے بعد "سرچ" بٹن پر کلک کردیں۔

ویب کے علاوہ تلاش کا عمل

چونکہ پورا انٹرنیٹ صرف ویب پر مشتمل نہیں ہے اور اس کے علاوہ بھی چند انٹرنیٹ ریسورسیز ہیں جو ویب سائٹ کی تلاش کے دوران آپ کی نظر سے مخفی رہتے ہیں۔ اس لیے آپ کے لیے سرچ انجن اور گیٹ ویز جیسے ذرائع موجود ہیں جن کی مدد سے ویب کے علاوہ کسی دوسرے میڈیا سے انفارمیشن تلاش کرنے کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے۔

یوزنیٹ کی تلاش

یوزنیٹ اور اس کے متعلقہ نیوز گروپس دراصل انٹرنیٹ پر عوامی مباحث کے بلیٹن بورڈ (Bulletin Board) ہیں۔ چونکہ یوزنیٹ پر پوسٹ کیے گئے آرٹیکل کئی ہفتوں اور بعض اوقات کئی ماہ بعد ایکسپائر ہوتے ہیں اس لیے کوئی ایسا طریقہ تو نہیں ہے کہ ہر اس چیز کو تلاش کرلیا جائے جو وہاں پوسٹ کی جاتی ہے لیکن یہ بہت حد تک ممکن ہے کہ تازہ ترین پوسٹ کیے گئے آرٹیکل تلاش کرلیے جائیں۔

یوزنیٹ کی تلاش کے لیے ایک بہترین سرچ انجن ڈیجانیوز "DejaNews" ہے اس کے لیے اپنے ویب براؤزر کو اس طرح پوائنٹ کریں:

http://www.dejanews.com/forms/dnq.html

پھر "سرچ فار" باکس میں وہ لفظ یا الفاظ ٹائپ کریں جنھیں تلاش کرنا مقصود ہے اور "سرچ" بٹن پر کلک کردیں۔ "ڈیجانیوز" آپ کو ان آرٹیکلز کی ایک لسٹ فراہم کرے گا جس میں آپ کے ٹائپ کیے ہوئے الفاظ شامل ہوں گے۔ نیز آپ کو آرٹیکل کے ٹیکسٹ کے ساتھ اور آرٹیکل کے مصنف کے ساتھ لنک بھی فراہم کرے گا۔ آرٹیکل کے سبجیکٹ پر کلک کرکے آپ آرٹیکل کے مندرجات ظاہر کرسکتے ہیں۔ Author پر کلک کرنے سے مصنف کا شخصی خاکہ ظاہر ہوگا۔

گوفراسپیس کی تلاش

ویب سے قبل انٹرنیٹ کی براؤزنگ کے لیے آسان ترین طریقہ گوفر کا استعمال تھا۔ گوفر پروگرام آپ کو مینو آئٹم کی ایک لسٹ فراہم کرتا ہے۔ کسی آئٹم کے انتخاب سے کسی ڈوکومنٹ یا کسی اور مینو تک رسائی حاصل ہوتی ہے۔ اگرچہ آپ گوفر مینوز کو دیکھنے کے لیے اسپیشل گوفر کلائنٹ پروگرام استعمال کرتے ہیں تاہم ویب براؤزرز کے ذریعے بھی گوفر انفارمیشن ظاہر کی جاسکتی ہیں۔ ویب پر سرچ کرنے کے لیے آسان طریقہ یہ ہے کہ اپنے براؤزر کو اس طرح پوائنٹ کریں:

gopher://veronica.psi.net:2347/7-t1%20%20

اس سے گوفر سرچ پیج ظاہر ہوگا اور جب آپ ٹیکسٹ باکس میں "کی ورڈز" ٹائپ کریں گے تو آپ کو ایک ایڈھاک گوفر مینو دے گا جس میں آپ کے ٹائپ کیے ہوئے الفاظ سے ملتے جلتے آئٹم ہوں گے۔

(تلخیص و ترتیب: محمد سلیم الدین ندوی)

صلاح الدین

کوئز

تعلیم

(1) ایجوکیشن کمیشن 66-1964 نے پورے ملک میں سفارش کی ہے:
(الف) غیر مساوی تعلیمی ڈھانچے کی۔
(ب) صرف بچوں کے تعلیمی ڈھانچے کی۔
(ج) مساوی تعلیمی ڈھانچے کی۔
(د) صرف پسماندہ طبقے کے لیے تعلیمی ڈھانچے کی۔

(2) والدین کو معذور بچوں کی تعلیمی ضروریات میں کس طرح مدد کرنی چاہیے؟
(الف) ان پر خاص توجہ دینی چاہیے۔
(ب) گھر میں اس معذور کے تئیں ہمدردانہ رویہ اپنانا چاہیے۔
(ج) اسکول کے ہوم ورک میں مدد کرنا چاہیے۔
(د) انھیں طبّی امداد بہم کرنا چاہیے۔

(3) استاد کا اصلی رول کیا ہے؟
(الف) بچوں میں سیکھنے کی صلاحیت کو صحیح ڈھنگ سے جلا دینا
(ب) بچوں کو آزاد چھوڑ دینا۔
(ج) بچوں میں سیکھنے کی صلاحیت کو دبانا۔
(د) بچوں میں سیکھنے کی صلاحیت کی ہمت افزائی نہیں کرنا۔

(4) تعلیمی نصاب کیسا ہونا چاہیے؟
(الف) متحرک (ب) غیر متحرک
(ج) منجمد (د) ان میں سے کوئی نہیں

(5) ''جس حسنِ برتاؤ کی تم اوروں سے امید رکھتے ہو، وہی برتاؤ ان کے ساتھ روا رکھو'' یہ قول کس مذہب کا ہے؟
(الف) عیسائیت (ب) اسلام
(ج) بدھ (د) جین

(6) کس تعلیمی کمیشن کی رپورٹ میں اس بات کو اجاگر کیا گیا ہے کہ سماجی اور قومی یکجہتی کو فروغ دینا تعلیم کا ایک بنیادی مقصد قرار دینا چاہیے؟
(الف) کوٹھاری کمیشن کی رپورٹ۔
(ب) ڈاکٹر ذاکر حسین کمیشن کی رپورٹ۔
(ج) رادھا کرشنن کمیشن کی رپورٹ۔
(د) ٹیگور کمیشن کی رپورٹ۔

(7) تعلیمی پروگراموں کی عمل آوری کے لیے ضروری ہے:
(الف) سماج کا اشتراک (ب) سماج کا سیاسی تعاون
(ج) سماج کا جزوی تعاون (د) سماج کا مالی تعاون

(8) آپریشن بلیک بورڈ کا کیا مقصد ہے؟
(الف) پرائمری اسکولوں کو کمرے مہیا کرنا
(ب) پرائمری اسکولوں میں سیکورٹی کا بندوبست کرانا
(ج) پرائمری اسکولوں کو اساتذہ مہیا کرنا
(د) پرائمری اسکولوں کو مہیا کی جانے والی سہولیات میں بہتری لانا

(9) لفظ 'ایجوکیشن' کا منبع کیا ہے؟
(الف) لاطینی زبان کا لفظ ایجوکیٹم (ب) لاطینی زبان کا لفظ کیٹم
(ج) لاطینی زبان کا لفظ ڈیمو (د) لاطینی زبان کا لفظ ڈم

(10) آپریشن بلیک بورڈ کا تعلق کس سے ہے؟
(الف) تعلیم سے (ب) مذہب سے
(ج) آزادی سے (د) جنگ سے

(11) ضابطی تعلیم (Formal Education) سے کیا مراد ہے؟
(الف) وہ تعلیم جو بچوں کو جان بوجھ کر مقررہ طریقے سے دی جاتی ہے۔
(ب) وہ تعلیم جو بچوں کو جان بوجھ کر غیر مقررہ طریقے سے دی جاتی ہے۔
(ج) وہ تعلیم جو بچوں کو بچپن میں دی جاتی ہے۔
(د) وہ تعلیم جو بچوں کو ریڈیو کے ذریعے دی جاتی ہے۔

(12) ''تعلیم سے میرا مطلب ان بہترین خوبیوں کا اظہار ہے جو بچے اور انسان کے جسم، دماغ اور روح میں پوشیدہ ہیں۔'' یہ قول کس کا ہے؟
(الف) گاندھی جی کا (ب) سقراط کا
(ج) فرابئل کا (د) جان ڈیوی کا

(13) یونیورسل پروگرام آف ایجوکیشن (سرو شکشا ابھیان) کے تحت کتنے سال کے بچوں کی تعلیم مفت اور لازمی قرار دی گئی ہے؟
(الف) 6 سے 14 سال کی عمر کے بچے
(ب) 4 سے 15 سال کی عمر کے بچے
(ج) 5 سے 16 سال کی عمر کے بچے
(د) 3 سے 12 سال کی عمر کے بچے

(14) وسیع معنوں میں تعلیم کا کیا مطلب ہے؟

(الف) تعلیم کا مطلب ہے انسان کو مہذب اور بلند خیال بنانا

(ب) تعلیم کا مطلب ہے انسان کو وحشی اور خوفناک بنانا

(ج) تعلیم کا مطلب ہے انسان کو قوم پرست بنانا

(د) تعلیم کا مطلب ہے انسان کو مذہبی بنانا

(15) قدیم زمانے کے تعلیمی اداروں ٹول میں کس زبان کی تعلیم دی جاتی تھی؟

(الف) سنسکرت کی (ب) انگریزی کی

(ج) تامل کی (د) پہلوی کی

(16) ہندستان میں جدید تعلیم کا جنم داتا کس کو کہا جاتا ہے؟

(الف) چارلس گرانٹ کو (ب) ولیم بینٹنگ کو

(ج) راجا رام موہن رائے کو (د) میکالے کو

(17) کلکتہ مدرسہ کی بنیاد کس نے ڈالی؟

(الف) لارڈ ڈلہوزی (ب) ولیم بینٹنگ

(ج) وارن ہسٹنگس (د) گرانٹ

(18) دیسی تعلیمی نظام پر ایڈم نے کتنی رپورٹیں پیش کیں؟

(الف) تین (ب) دو

(ج) پانچ (د) چار

(19) شملہ تعلیمی کانفرنس کس کی صدارت میں ہوئی تھی؟

(الف) لارڈ کرزن (ب) میکالے

(ج) جوناتھن (د) چارلس گرانٹ

(20) وردھا تعلیمی کانفرنس کی صدارت کس نے کی تھی؟

(الف) پنڈت جواہر لعل نہرو (ب) گاندھی جی

(ج) رابندر ناتھ ٹیگور (د) میکالے

(21) "ہائی اسکولوں میں صرف ان طلبہ کو داخلہ دیا جانا چاہیے جن کی قابلیت اوسط درجے کے طلبہ سے زیادہ ہو۔" یہ کس رپورٹ میں کہا گیا تھا؟

(الف) سارجنٹ رپورٹ میں (ب) وڈ ایبٹ رپورٹ میں

(ج) میکالے رپورٹ میں (د) چارلس گرانٹ رپورٹ میں

(22) کند ذہن بچوں کی مدد استاد کیسے کرتا ہے؟

(الف) اسے مخصوص علاج کے لیے بھیجتا ہے۔

(ب) مخصوص اسکول کے حوالے کرتا ہے۔

(ج) سیکھنے کے ٹھوس تجربات فراہم کرتا ہے۔

(د) اس کا مسئلہ جان کر حل نکالتا ہے۔

(23) جماعت میں معذور بچوں سے واسطہ پڑنے پر استاد کا پہلا قدم کیا ہونا چاہیے؟

(الف) معذوری کی نشاندہی کرنا

(ب) جماعت میں مخصوص انتظام کرنا

(ج) اس کے سیکھنے کے مسائل کی تشخیص کرنا

(د) مناسب اور موافق ایجنسیوں سے رابطہ کرنا

(24) نفسیاتی تعلیم کا کیا مقصد ہے؟

(الف) انسانی کردار کی تعمیر (ب) انسانی کردار کی ترقی

(ج) انسانی کردار کی بربادی (د) انسانی کردار کی نمائش

(25) ویدک ادب میں تعلیم کا استعمال کن معنوں میں کیا گیا ہے؟

(الف) ودّیا (علم) (ب) آتما (روح)

(ج) صلاحیت (د) پرشرم (محنت)

(26) ہندستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم بنیادی طور پر کیا تھا؟

(الف) سیاسی (ب) دینی

(ج) سماجی (د) ان میں سے کوئی نہیں

(27) زمانہ قدیم کے تعلیمی ادارے گھٹیکا میں کس طرح کی تعلیم دی جاتی تھی؟

(الف) ویدک تعلیم (ب) مذہب اور فلسفے کی تعلیم

(ج) سماجی و جنگی تعلیم (د) سیاسی و اقتصادی تعلیم

(28) "تعلیم کا مطلب ہے ہر انسان کے دماغ میں پوشیدہ شکل میں کائنات سے تسلیم شدہ موجودہ خیالات کو واضح کرنا۔" یہ قول کس کا ہے؟

(الف) افلاطون (ب) سقراط

(ج) ارسطو (د) مہاتما گاندھی

(29) "ایجوکیشنل ری کنسٹرکشن ان انڈیا" کس کی کتاب ہے؟

(الف) رادھا کرشنن (ب) ڈاکٹر ذاکر حسین

(ج) رابندر ناتھ ٹیگور (د) غلام دستگیر

(30) "وڈ ڈسپیچ" میں کس پہلو پر بحث کی گئی ہے؟

(الف) ہندستانی تعلیم کے اہم پہلوؤں پر

(ب) ہندستانی سماج کے اہم پہلوؤں پر

(ج) ہندستانی نوجوانوں کے اہم پہلوؤں پر

(د) ہندستانی عورتوں کے اہم پہلوؤں پر

(31) ایڈم کی تیسری تعلیمی رپورٹ کتنے حصوں میں منقسم ہے؟

(الف) تین (ب) دو

(ج) پانچ (د) چار

(32) قدیم زمانے میں "چرن" میں کس طرح کی تعلیم دی جاتی تھی؟

(الف) وید کے صرف ایک حصے کی تعلیم
(ب) وید کے صرف دو حصوں کی تعلیم
(ج) وید کے چار حصوں کی تعلیم
(د) وید کے صرف تین حصوں کی تعلیم

(33) "مسلمانوں کا تعلیمی نظام" کس کی کتاب ہے؟
(الف) ضیاء الحسن فاروقی (ب) خالد یار خاں
(ج) نوراللہ دنا یک (د) عبداللہ عباس ندوی

(34) 1998-99 کے اعداد وشمار کے مطابق ہندستان میں مرکزی یونیورسٹیوں کی تعداد کیا تھی؟
(الف) 15 (ب) 20
(ج) 12 (د) 10

(35) I.I.T. کو ایک انجینئر تیار کرنے میں کتنا خرچ لگتا ہے؟
(الف) 8 لاکھ (ب) 5 لاکھ
(ج) 7 لاکھ (د) 12 لاکھ

(36) شروعاتی دور میں آئی آئی ٹی دہلی لندن کے کس کالج سے ملحق تھا؟
(الف) امپیریل کالج لندن (ب) کالج آف لندن
(ج) کالج آف آرٹس لندن (د) کالج آف سائنس لندن

(37) سائنٹفک سوسائٹی کس لیے قائم کی گئی تھی؟
(الف) ہندوؤں میں مغربی علوم سے دلچسپی پیدا کرنے کے لیے
(ب) مسلمانوں میں مغربی علوم سے دلچسپی پیدا کرنے کے لیے
(ج) پس ماندہ طبقوں میں مغربی علوم سے دلچسپی پیدا کرنے کے لیے
(د) سکھوں میں مغربی علوم سے دلچسپی پیدا کرنے کے لیے

(38) تعلیم کو پیشہ ورانہ بنانے کی سفارش کس نے کی؟
(الف) کوٹھاری کمیشن (ب) رادھا کرشنن کمیشن
(ج) ڈاکٹر ذاکر حسین کمیشن (د) ہنٹر کمیشن

(39) مندرجہ ذیل میں سے کون مادری زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے کے حق میں تھے؟
(الف) جواہر لال نہرو (ب) رابندر ناتھ ٹیگور
(ج) رادھا کرشنن (د) ڈاکٹر ذاکر حسین

(40) "اسکول اینڈ سوسائٹی" کس کی کتاب ہے؟
(الف) جان ڈیوی (ب) ڈاکٹر ذاکر حسین
(ج) گاندھی جی (د) رابندر ناتھ ٹیگور

(41) 'بوجھ کے بغیر مطالعہ' کا تصور کس نے پیش کیا؟
(الف) سیڈ لی کمیشن نے (ب) یشپال کمیشن نے
(ج) گجرال کمیشن نے (د) ہنٹر کمیشن نے

(42) "اسکول کے اندر یا باہر" کس کی لکھی ہوئی کتاب ہے؟
(الف) ڈاکٹر راج کمار (ب) علامہ اقبال
(ج) نوراللہ دنا یک (د) خالد یار خاں

(43) "فلسفہ اور تعلیم ایک سکے کے دو پہلوؤں کی طرح ہیں۔ ایک میں دوسرا مضمر ہے۔ فلسفہ زندگی کا غور وفکر کا پہلو ہے اور تعلیم مستعد زندگی کا پہلو ہے" یہ قول کس کا ہے؟
(الف) جان ڈیوی (ب) راس
(ج) ارسطو (د) اسپنسر

(44) ہندستان کی سب سے تعلیم یافتہ دو ریاستیں کون کون ہیں؟
(الف) کیرالہ اور مغربی بنگال (ب) بہار اور اتر پردیش
(ج) گجرات اور جموں وکشمیر (د) ہریانہ اور آسام

(45) کس رپورٹ نے تعلیم بالغاں کو بہت ضروری قرار دیا؟
(الف) سارجنٹ رپورٹ (ب) وڈ ایبٹ رپورٹ
(ج) میکالے رپورٹ (د) کرزن رپورٹ

(46) ہندستانی یونیورسٹیز ایکٹ کس گورنر جنرل نے پاس کروایا؟
(الف) لارڈ کرزن (ب) لارڈ ولیم
(ج) لارڈ ڈلہوزی (د) لارڈ کارنوالس

(47) "یہ میری خواہش ہے کہ ہندستان کی سرزمین پر اسکول اور کالجوں کا ایک جال بچھا دیا جائے۔" یہ کس کا قول ہے۔
(الف) لارڈ ولیم بینٹنک (ب) جارج پنجم
(ج) لارڈ کرزن (د) لارڈ کارنوالس

(48) کس یونیورسٹی کمیشن نے انٹرمیڈیٹ کلاسوں کو یونیورسٹی سے الگ کرنے کی سفارش کی؟
(الف) بنارس ہندو یونیورسٹی کمیشن
(ب) کلکتہ یونیورسٹی کمیشن
(ج) علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کمیشن
(د) یونیورسٹی سروس کمیشن

(49) حکومت ہند نے 1936 میں انگلینڈ کے کن دو مشہور ماہرین تعلیم کو ہندستان آنے کے لیے مدعو کیا؟
(الف) جان لیبر اور جان منگر تھم (ب) ایس ایچ وڈ اور ایبٹ

(ج) ڈاکٹر گرودوراور ڈاکٹرلی (د) ڈاکٹر جیمس اور براؤن

(50) تعلیم کیا ہے؟

(الف) اندرونی صلاحیتوں کو ابھارنے کا طریقہ کار

(ب) باہری صلاحیتوں کو آراستہ کرنے کا طریقہ کار

(ج) صحیح راستہ بتانا

(د) عیش وآرام کے طریقہ کار بتانا

(51) ''انسان کی جبلی قوتوں کی فطری ہم آہنگی اور ترقی پذیر بالیدگی کو تعلیم کہتے ہیں'' یہ قول کس کا ہے؟

(الف) سقراط (ب) پستالوزی

(ج) ارسطو (د) گاندھی جی

(52) ''بنیادی تعلیم ہمارے بابائے قوم کا آخری اور غالباً عظیم ترین عطیہ ہے۔''

یہ قول کس کا ہے۔

(الف) ڈاکٹر ذاکر حسین (ب) رابندر ناتھ ٹیگور

(ج) اویناش لنگم (د) نور اللہ وناییک

(53) تعلیم میں سماجی جذبے کو شامل کرنے کا سہرا کس کو جاتا ہے؟

(الف) ہربرٹ اسپنسر (ب) پستالوزی

(ج) سقراط (د) فرائبل

(54) انفرادی نقطۂ نظر سے تعلیم کا کیا مطلب ہے؟

(الف) فرد کی تمام قوتوں کو پوری طرح ترقی دینا

(ب) فرد کی تمام ضرورتوں کو بخوبی پورا کرنا

(ج) فرد کا تمام سیاسی جماعتوں سے رابطہ کرانا

(د) ان میں سے کوئی نہیں

(55) تعلیم کے مقاصد کا تعین کون کرتا ہے؟

(الف) سماجیات (ب) فلسفہ

(ج) تواریخ (د) ان میں سے کوئی نہیں

(جوابات اسی شمارے میں تلاش کریں)

352 E. Deshraj Tokas House,
Munirka Village,
New Delhi-110067

□□□

بہادری کے کارنامے

مصنف: منوج داس/ مترجم: ایس ایم احمد

ہمارے ملک کو انگریزوں سے آزادی حاصل کرنے کے لیے لاتعداد قربانیاں دینی پڑی ہیں۔ جن سورماؤں نے اپنی جان آزادیٔ وطن کے لیے نچھاور کی، ان کی ایک طویل فہرست ہے۔ زیر نظر کتاب میں جدوجہد آزادی کے ابتدائی دور کے ایسے ہی بہادر سپوتوں کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔

صفحات: 83، قیمت: -/25 روپے

رام پرشاد بسمل کی آپ بیتی

مرتب: ڈاکٹر وشوامترا اپادھیائے/ مترجم: احسان احمد صدیقی

مادر وطن کی آزادی کے لیے اپنی جان کی قربانی پیش کرنے والوں میں مشہور انقلابی رام پرشاد بسمل سرفہرست ہیں۔ یہ آپ بیتی انھوں نے گورکھپور جیل میں اپنی پھانسی سے دو دن پہلے مکمل کی تھی۔ جدوجہد آزادی کے اس دور کی حقیقی تصویر کشی کے سبب یہ آپ بیتی دستاویزی اہمیت کی حامل ہے۔

صفحات: 109، قیمت -/33 روپے

سرحدی گاندھی خان عبدالغفار خاں

مصنف: راجندر راوتھی/ مترجم: جہاں افتخار خاں

خان عبدالغفار خاں کی زندگی طوفانوں کی تاریخ ہے۔ ہندستان کی جنگ آزادی سے لے کر پاکستان کے قیام کے بعد تک وہ پختونوں کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کے خلاف غریبوں اور مظلوموں کی لڑائی لڑتے رہے اور اس لڑائی میں ان کی زندگی کا بیشتر حصہ جیل میں گزرا۔ سرحدی گاندھی کے حالات زندگی سے واقفیت کے لیے اس کتاب کا مطالعہ کریں۔

صفحات: 78، قیمت: -/21 روپے

[illegible]

مصنف: درگا پرشاد شکل/ مترجم: جہاں آرا

تین زنگ نورگے اور ایڈمنڈ ہلیری کوہ پیمائی کی تاریخ کے روشن باب ہیں۔ زیر نظر کتاب میں تین زنگ نورگے کی سوانح حیات کے ساتھ ساتھ ایوریسٹ کی چوٹی سر کرنے کی مہم کی پوری تفصیل درج ہے۔

طلبہ کے لیے ایک بے حد معلوماتی کتاب۔

صفحات: 87، قیمت: -/21 روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر۔کے۔ پورم، نئی دہلی

محمد سہیم الدین — کمپیوٹر سینٹر کے فارغ طلبہ کے انٹرویو-6

بڑھتے قدم

جمال احمد نے، جن کے والدکسان ہیں، بارھویں تک کی تعلیم ایک پبلک اسکول میں حاصل کی۔ اس کے بعد بی.کام کیا — بی.کام کے دوران ہی انھوں نے قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان کا ایک سال کا ڈپلوما اِن کمپیوٹر اپلی کیشن اینڈ ملٹی لنگول ڈی.ٹی.پی. کورس کیا اور ابھی ایک پرائیویٹ ادارے میں نوکری کررہے ہیں۔ ان کا مختصر انٹرویو قارئینِ "اردو دنیا" کے لیے پیش ہے۔

سوال: کمپیوٹر سے آپ کو کیسے دلچسپی ہوئی؟

جواب: میگزین و اخبارات ہماری زندگی میں کافی اثر انداز ہوتے ہیں اور یہی ہمارے ساتھ بھی ہوا۔ میگزین اور نیوز پیپر میں جب میں کمپیوٹر سے متعلق کوئی خبر یا مضمون پڑھتا تھا تو ایک جستجو پیدا ہوتی تھی کہ آخر یہ کس قسم کی مشین ہے جو ہماری زندگی میں اس قدر حائل ہے یا جس کے بغیر ہماری زندگی ادھوری ہے اور پھر یہی جستجو دلچسپی کا باعث ہوئی۔

سوال: قومی اردو کونسل کے کمپیوٹر سینٹر دوسرے سینٹروں سے کس اعتبار سے مختلف ہیں؟

جواب: یہ سستا بھی ہے اور اس نے اپنا اعلا معیار بھی برقرار رکھا ہے۔ یہ اچھی تعلیم و تربیت کی وجہ سے اپنے آپ میں ممتاز ہے۔ علاوہ ازیں اردو کی تعلیم سونے پہ سہاگہ کا کام کرتی ہے جو کہ شاید کہیں اور کم از کم میرے علم کے مطابق نہیں ہے۔

سوال: قومی اردو کونسل کے کمپیوٹر سینٹروں میں جو تربیت دی جارہی ہے، اُس سے آپ کس حد تک مطمئن ہیں؟

جواب: کافی حد تک۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ان سینٹروں کے اساتذہ مشفق بھی ہیں اور باصلاحیت بھی، جو ہر وقت ہر طرح سے تعاون دینے کو تیار رہتے ہیں۔

سوال: قومی اردو کونسل کے کمپیوٹر سینٹر اُردو داں طبقے کو روزگار فراہم کرانے میں کس حد تک معاون ہیں؟

جواب: کامیاب وہی ہوتا ہے جو اپنے اندر کمال پیدا کرلے، ہاں البتہ اس کے ذرائع تک رسائی حاصل کرنے میں کوئی مدد کرسکتا ہے۔ قومی اردو کونسل کا یہ ڈپلوما درحقیقت اپنے آپ میں ایک بہت بڑی چیز ہے اور اس کی وجہ سے بہ آسانی روزگار مل سکتا ہے بلکہ مل بھی رہا ہے اور لوگ فائدہ بھی اٹھا رہے ہیں۔ اس لیے ان حضرات کو چھوڑ کر جو صرف ڈگری یا ڈپلوما پر بھروسہ کرکے بیٹھ جاتے ہیں، قومی اردو کونسل کا یہ ڈپلوما اردو داں طبقے کو روزگار فراہم کرنے میں صدفی صد معاون ہے۔

سوال: انفارمیشن ٹیکنالوجی کی دنیا کا حصہ بن کر آپ کو کیسا لگ رہا ہے؟

جواب: اس کے عدمِ حصول کی وجہ سے میں اپنے اندر جو کمی پاتا تھا اور احساسِ کمتری کا شکار تھا، اس سے نجات مل گئی ہے بلکہ اپنے آپ میں ایک خود اعتمادی آئی ہے اور ایسا لگ رہا ہے کہ میں بھی زمانے کے ساتھ ہوں، زمانے سے پیچھے نہیں۔

سوال: اس میدان میں آنے کے بعد کیا آپ میں کوئی بدلاؤ آیا ہے؟ کیا آپ کی خود اعتمادی اور خود انحصاری میں اضافہ ہوا ہے؟

جواب: ظاہر ہے، خود اعتمادی اور خود انحصاری میں نہ صرف یہ کہ اضافہ ہوا ہے بلکہ درحقیقت اس کورس کے بعد ہی ہمارے اندر خود اعتمادی پیدا ہوئی۔

سوال: آپ لازمی طور پر ملٹی لنگول ہیں۔ یہ آپ کے لیے ایک بے حد مثبت چیز ہے۔ آپ اپنی اس خصوصیت کی بنا پر مارکیٹ میں اپنے آپ کو کس مقام پر پاتے ہیں؟

جواب: ایک بہتر مقام پر، ایک ایسے مقام پر جہاں میرے لیے کئی دروازے ہیں اور میرے اندر اس کی صلاحیت ہے کہ کسی بھی دروازے کو کھٹکھٹا سکوں۔

سوال: آپ نے کمپیوٹر سینٹر میں جو فیس ادا کی، وہ آپ کے لیے بوجھ تو نہ تھی؟

جواب: قطعی نہیں، بلکہ میرے خیال میں اس طرح کا کورس اتنی فیس میں کسی اور سینٹر سے ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔

□□□

اردو خبر نامہ

قومی اردو کونسل میں پروفیسر گوپی چند نارنگ کا استقبال

● نئی دہلی، 9/دسمبر۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ کو دوبارہ قومی اردو کونسل کا وائس چیئر مین نامزد کیے جانے کے بعد کونسل میں ان کا استقبال کیا گیا۔ اس موقعے پر قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ نے انھیں خوش آمدید کہتے ہوئے کہا کہ جب نارنگ صاحب کی مدت کار ختم ہوگئی تھی تب بھی انھوں نے فروغ اردو کے سلسلے میں قومی اردو کونسل کے ذریعے کیے جارہے کاموں کا ذکر ہر ادبی محفل اور ذاتی انٹرویو میں کیا۔ یہ خوشی کی بات ہے کہ وہ دوبارہ کونسل کے وائس چیئر مین بن گئے ہیں۔ اس سے فروغ اردو کے کاموں میں مزید تیزی آئے گی۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ نے مزید کہا کہ تقسیم ہند کے بعد اردو کے کاز کو آگے بڑھانے کے لیے کئی مزاحمتوں سے دوچار ہونا پڑا لیکن اس کے باوجود خود اردو والوں اور مرکزی و ریاستی سرکاروں نے جو کوششیں کی ہیں، وہ اہم ہیں۔ اردو بھارتیہ سنسکرتی اور ہندستانی مین اسٹریم کا جزو لاینفک ہے۔ اس سیاق میں اردو والوں اور اردو اداروں کی ذمے داری مزید بڑھ جاتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ پچھلے پانچ چھ برسوں میں قومی اردو کونسل نے اردو کو آئین ہند کے آٹھویں شیڈول میں درج دوسری زبانوں کے نزدیک کرنے کی جو کوشش کی ہے، وہ اہم ہے اور دوسری طرف اردو کو انفارمیشن ٹیکنالوجی سے جوڑنے کی کاوش بھی رنگ لانے لگی ہے۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اس موقعے پر کہا کہ اردو کے تمام ہندستانی اداروں میں قومی اردو کونسل سب سے زیادہ فعال ہے اور یہ فروغ اردو کے اپنے مختلف پروگراموں پر کامیابی سے عمل درآمد کرتے ہوئے اپنے وجود کا احساس کرا رہی ہے اور اس کے لیے قومی اردو کونسل کے فعال سربراہ ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ اور ان کی ٹیم قابلِ مبارک باد ہے۔

اردو سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ ہندستانی زبانوں میں اگر کوئی زبان رابطے یا پُل کا کام کرتی ہے تو وہ اردو ہے۔ پورے جنوبی ایشیا میں اردو کوئی نہ کوئی شکل سماجی زندگی میں کارگر دکھائی دیتی ہے۔ روزمرّہ زندگی، کاروبار، میڈیا اور دیگر تمام شعبوں میں اردو اپنی خصوصیات کی وجہ سے مقبول ہے۔ اردو میں تمام علوم کی کتب موجود ہیں۔ آج ضرورت اس بات کی ہے کہ اسکول سے کالج کی سطح تک کی معیاری نصابی کتب تیار کی جائیں جن سے طلبہ استفادہ کر سکیں۔ اس سلسلے میں بھی قومی اردو کونسل کا کام تسلی بخش رہا ہے اور اب اسے مزید رفتار دینی ہوگی۔

قومی اردو کونسل کی طرف سے چلائے جانے والے کمپیوٹر کورس کی افادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے پروفیسر نارنگ نے کہا کہ کونسل نے پچھلے پانچ برسوں میں ملک بھر میں کمپیوٹر سینٹروں کا جال بچھا کر قابلِ قدر کارنامہ انجام دیا ہے اور اردو کو انفارمیشن ہائی وے پر لا کھڑا کیا ہے۔ انھوں نے اردو سکھانے کے مراسلاتی کورس کو ایک خوش آئند قدم قرار دیتے ہوئے کہا کہ منسٹری سے لے کر بیوروکریسی، صحافت، فلم اور ٹی وی میڈیا تک اس کورس کی پذیرائی ہو رہی ہے۔ کونسل کے کتاب میلوں، موبائل وین کے ذریعے اردو کتب دور دراز کی اردو بستیوں میں پہنچانے اور دیگر پروگراموں کی کامیابی پر مسرت کا اظہار کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ کونسل کے ان اقدامات کے ذریعے اردو کی صحیح معنوں میں ترویج ہو رہی ہے اور اردو سے متعلق مائنڈ سیٹ تبدیل ہو رہا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو کے مشترکہ تشخص کو اور زیادہ ہائی لائٹ کیا جائے۔

آخر میں انھوں نے قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ، پرنسپل پبلیکیشن آفیسر ڈاکٹر آر۔ کے۔ بھٹ اور کونسل کے دیگر کارکنان کا شکریہ ادا کیا۔

ہندستانی کرکٹ کا ابھرتا ستارا — عرفان پٹھان

● حال ہی میں انڈر 19 کرکٹ ٹیم کے نوجوان کھلاڑی عرفان پٹھان کو ایشیا کرکٹ چمپین شپ میں شاندار کارکردگی کے مظاہرے کے بعد قومی ٹسٹ ٹیم میں شامل کیا گیا ہے۔ عرفان نے اس سے قبل کوئی فرسٹ کلاس میچ نہیں کھیلا ہے لیکن قومی ٹسٹ ٹیم میں اس کی شمولیت نے یہ ثابت کردیا ہے کہ محنت اور لگن سے انسان تمام بلندیوں کو چھو سکتا ہے اور منزلِ مقصود تک پہنچ سکتا ہے۔ 23/نومبر 2003 کے "ٹائمس آف انڈیا" نئی دہلی میں ساجد شیخ کی دلچسپ تحریر شائع ہوئی ہے جسے قارئینِ "اردو دنیا" کی نذر کیا جارہا ہے۔ اس کا ترجمہ مشرف علی نے کیا ہے۔

عرفان پٹھان ہندستانی کرکٹ ٹیم کا سب سے کم عمر کھلاڑی ہے۔ وہ وجیہہ ہونے کے ساتھ اب خوبرو بھی ہوگیا ہے۔ ایسا اس کے شہر کی لڑکیاں کہتی ہیں۔ وہ ایک نہایت عام انسان ہے اور اس کے قدم زمین پر ہیں۔ ہندستانی کرکٹ ٹیم کے نئے کھلاڑی عرفان پٹھان کو ابھی بھی دس روپے کی آئس کریم کچھ مہنگی ہی لگتی ہے۔

اگر آپ کو ایسا لگتا ہے کہ عرفان پٹھان کو ملی کامیابی اس کی شخصیت کو تبدیل کردے گی تو پھر ایک بار غور کیجیے۔ انڈر 19 ایشیا کرکٹ چمپین شپ میں عالمی ریکارڈ کی حامل شاندار کارکردگی (بنگلہ دیش کے خلاف میچ میں عرفان پٹھان نے 16 رن دے کر 9 وکٹ

ہندو پاک میں اردو ادب کے مختلف پہلوؤں پر کانفرنس

● نئی دہلی، 15 رنومبر۔ ''فاؤنڈیشن آف سارک رائٹرس اینڈ لٹریچر'' کی طرف سے ''ہندو پاک قلم اور امن کانفرنس'' میں شرکت کی غرض سے جانے والے اردو، ہندی اور پنجابی کے ممتاز ادیبوں اور دانشوروں کے وفد کے شرکا مسز اجیت کور، سیدہ سیدین، جیلانی بانو، منوہر شیام جوشی، ڈاکٹر شہپر رسول، ڈاکٹر چترا مدگل، ڈاکٹر کمل کمار، پروفیسر جگتار سنگھ، ڈاکٹر اندرا گوسوامی اور محترمہ تارن کور گجرال کا واگھہ بورڈر پر 17 راکتوبر کو خیر مقدم کیا گیا۔ اس موقعے پر استقبال کرنے والوں میں پاکستان کے ممتاز ادیب و دانشور جناب انتظار حسین، کشور ناہید، انور سجاد، طاہر مظہر علی، سلیمہ ہاشمی، مبشر حسن، جاوید شاہین، منو بھائی، نصرت شیخ اور خادم حسین کے علاوہ دیگر متعدد اشخاص شامل تھے۔ علامہ اقبال کے صاحبزادے جناب جاوید اقبال نے ہندستانی وفد کے لیے اپنے دولت کدے پر ڈنر کا اہتمام کیا۔ اس موقعے پر مختار مسعود، امجد اسلام امجد، جسٹس سردار اقبال، کشور ناہید، امتیاز علی تاج کی بیٹی اور دیگر بہت سے ادیبوں نے ہندستانی ادیبوں سے مختلف موضوعات پر تبادلۂ خیال کیا۔ اگلے دن کانفرنس کے افتتاحی اجلاس کی مجلسِ صدارت میں جناب احمد ندیم قاسمی، اجیت کور اور ڈاکٹر مبشر حسن شامل رہے۔ اجلاس کے آغاز میں فیض احمد فیض کے داماد شعیب ہاشمی نے فیض کی ایک نظم پیش کی۔ کلیدی خطبات احمد ندیم قاسمی اور اجیت کور نے پیش کیے۔ ہندستانی ادیبوں نے فرداً فرداً اجلاس کو خطاب کیا۔ نظامت کے فرائض کشور ناہید نے انجام دیے۔ اس تقریب میں دہشت گردی اور امن کے موضوع پر ایک ڈرامہ اور اقبال باہو کی آواز میں کلام باہو بھی پیش کیا گیا۔ 19 راکتوبر کو ہندستانی ادیبوں کا وفد لاہور سے اسلام آباد پہنچا۔ جہاں چار بجے شام افتتاحی اجلاس عمل میں آیا جس کی صدارت جناب مشتاق احمد یوسفی نے کی۔ استقبالیہ خطبات زہرہ نگاہ اور خادم حسین نے اور اجیت کور نے کلیدی خطبہ پیش کیا۔ نظامت کشور ناہید نے کی۔ 20 راکتوبر کو پہلا اجلاس ''انسانی مصائب، صداقت اور مصالحت کا عمل'' کے عنوان سے منعقد ہوا جس میں ڈاکٹر سیدہ سیدین اور انتظار حسین نے کلیدی خطبے پیش کیے۔ ڈاکٹر چترا مدگل، منو بھائی، تارن کور گجرال اور فہمیدہ ریاض نے صدارت اور حارث خلیق نے نظامت کی۔ دوسرا اجلاس ''گذشتہ نصف صدی میں ہندو پاک کے ادب میں نمودار ہونے والے نئے رجحانات'' سے متعلق تھا۔ اس میں منوہر شیام جوشی اور انوار احمد نے کلیدی خطبے پیش کیے۔ مجلسِ صدارت میں جیلانی بانو، اندرا گوسوامی، ڈاکٹر شہپر رسول، ڈاکٹر رشید امجد اور ثمینہ راجا تھے۔ انور زاہدی نے نظامت فرمائی۔ تیسرے اجلاس میں تخلیقی ادب پیش کیا گیا جس کی صدارت ضیا جالندھری، جگتار سنگھ، آفتاب اقبال شمیم، شبنم شکیل اور سرمد صہبائی نے اور نظامت محبوب ظفر نے کی۔ اجیت کور، ڈاکٹر شہپر رسول، تارن کور گجرال اور کمل کمار کے علاوہ پاکستانی ادبا و شعرا نے بھی اپنی شعری اور نثری تخلیقات سے نوازا۔ 21 راکتوبر کو کانفرنس کے چوتھے اجلاس میں ''ہندو پاک کے ادب میں جنس کے امتیاز کی بنیاد پر سامنے آنے والے موضوعات'' پر گفتگو ہوئی۔ چترا مدگل اور خالدہ حسین نے اس اجلاس میں کلیدی خطبے دیے۔ مجلسِ صدارت ڈاکٹر کمل کمار، زیتون بانو، فوزیہ سعید اور ڈاکٹر انوار احمد پر مشتمل تھی۔ نظامت ڈاکٹر فاطمہ حسن نے کی۔ پانچویں اجلاس میں ''ادب میں آزاد خیالی کے بالمقابل بنیاد پرستی کا تصور'' کے عنوان سے طاہر محمد خاں اور اجیت کور نے کلیدی خطبے دیے اور صدارت منوہر شیام جوشی، ڈاکٹر طارق رحمان اور ڈاکٹر فوزیہ سعید نے کی۔ اختتامی اجلاس نارو تحسین سفیر کی صدارت میں منعقد ہوا۔ محمد منشا یاد اور ڈاکٹر سیدہ سیدین نے ترتیب وار اردو اور انگریزی میں کانفرنس

لیے۔) کے مظاہرے کے بعد بھی اس کی زندگی میں شاید ہی کوئی تبدیلی آئی ہے۔ وہ ابھی بھی بیہودا کاوہی لڑکا ہے جو دن میں پانچ مرتبہ نماز ادا کرتا ہے، جامع مسجد سے متصل اپنے ایک کمرے کے مکان میں رہتا ہے اور اپنی وہی پرانی سائیکل چلاتا ہے جو اس کے والد نے اسے دی تھی کیونکہ قسط پر خریدی گئی ہیرو ہونڈا موٹر سائیکل کے لیے ابھی بھی پٹرول خریدنا اسے مہنگا لگتا ہے۔ وہ اپنا خالی وقت آج بھی اپنے دوستوں کے ساتھ مسجد کی سیڑھیوں پر گزارتا ہے۔ اس کے لیے جشن اور خوشی منانے کا مطلب ماں کی بنائی ہوئی بریانی اور کبھی کبھار دوستوں کے ساتھ فلم دیکھنا ہے۔

ابھی تک عرفان نے اعلا رہائشی علاقے 'الکاپوری' یا چہل پہل والے علاقے 'فتح گنج' کی بھی سیر نہیں کی ہے۔ اس کی دنیا کرکٹ، اس کا گھر اور مسجد تک ہی محدود ہے، اور اسے اس بات کا کوئی افسوس بھی نہیں ہے۔ عرفان کے مطابق مسجد اس کے لیے درس گاہ کی حیثیت رکھتی ہے اور وہ 9 بجے رات سے پہلے گھر آجاتا ہے۔

عرفان کا خاندان اس مسجد سے متصل کمرے میں رہتا ہے جہاں اس کے والد موذن ہیں جو کہ ایک نہایت ہی عام انسان ہیں۔ عرفان کی ماں، شمیم بانو کہتی ہیں کہ ''میں نہیں سمجھتی کہ ہمیں گھر تبدیل کرنے کی ضرورت ہے۔ ہم لوگ اپنے مسجد سے متصل گھر میں رہنے میں ہی خوش ہیں۔ وہ یہ تسلیم کرتی ہیں کہ یہاں صرف ایک کمرہ ہے جو ان کے لیے ناکافی ہے۔ لیکن ان کا کہنا ہے کہ ہم نے اپنی ساری زندگی یہیں گزاری ہے اس لیے ہمیں کسی قسم کی تکلیف کا احساس نہیں ہوتا۔

عرفان کے والد محمود خاں کی ماہانہ آمدنی کچھ عرصے قبل تک صرف 700 روپے ماہانہ تھی اور کچھ آمدنی انھیں اپنی چھوٹی سی عطر کی دکان سے ہوتی تھی جو مسجد کی سیڑھیوں کے قریب ہے۔ لیکن اس معمولی

کی سفارشات پیش کیں اور اختتامی کلمات کشور ناہید اور اجیت کور نے پیش کیے۔ کانفرنس میں جن امور پر بطور خاص زور دیا گیا ان میں کسی بھی صورت میں ہندوپاک کے مابین جنگ نہ ہونا، انسانی اقدار کی بحالی میں عملی اشتراک کرنا، ویزا کی شرائط کو آسان کرنا، ہوائی اور ریل کے راستوں کو کھولنا، بسوں کی تعداد میں اضافہ کرنا، موجودہ مسائل کو باہمی مذاکرات کے ذریعے حل کرنا اور ادبی، تہذیبی اور تعلیمی سطحوں پر اشتراکِ عمل کرنا شامل تھا۔ (ڈاک سے)

علامہ اقبال کی جڑیں پلوامہ (کشمیر) کے گاؤں ساپیر میں

● نئی دہلی، 4 نومبر۔ کشمیری محققین کے ایک گروپ نے معروف اردو شاعر علامہ اقبال کی جڑوں کا سراغ لگالیا ہے۔ ان کے آباؤ اجداد ضلع پلوامہ کے گاؤں ساپیر کے رہنے والے تھے، بعد میں وہاں سے وہ شمالی کشمیر کے خطے لولاب میں جا بسے اور پھر وہاں سے سیالکوٹ ہجرت کر گئے، جو اب پاکستان میں ہے۔

31 سال کی گہری چھان بین کے بعد ممتاز کشمیری ادیب محمد یوسف ٹینگ یہ تحقیق کرنے میں کامیاب ہوگئے ہیں کہ علامہ اقبال کی جڑیں سری نگر سے 60 کلومیٹر دور گاؤں ساپیر میں ہیں۔ اب اس چھوٹے سے گاؤں کا نام بدل کر خیابانِ اقبال رکھ دیا گیا ہے۔

ڈاکٹر ٹینگ کے انکشاف کے بعد ہی گاؤں والوں نے اقبال کے نام سے ایک یادگار تعمیر کرنے کے لیے 5 ایکڑ زمین کا عطیہ دیا ہے۔ اس شاعرِ اعظم کی یاد میں حکومت نے ایک لائبریری اور ایک آڈیٹوریم تعمیر کرانے کا منصوبہ تیار کیا ہے جس نے لافانی گیت ''سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا'' لکھا ہے۔
(قومی آواز، نئی دہلی)

پرینکا گاندھی اردو سیکھ رہی ہیں

● نئی دہلی۔ پہلے یہ خبر آئی تھی کہ مرکزی وزیر خزانہ شری جسونت سنگھ اردو سیکھ رہے ہیں اور اس کے لیے انھوں نے قومی اردو کونسل کی طرف سے چلائے جانے والے اردو ڈپلوما کورس میں داخلے کے لیے اپنی درخواست مع فیس بھی جمع کردی ہے۔ کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ نے بتایا کہ مسٹر جسونت سنگھ نے ایک طالب علم اور ایک عام شہری کی حیثیت سے یہ درخواست دی ہے اور ان کی سرکاری حیثیت کا علم تو اس وقت ہوا جب ان کی درخواست کی جانچ پڑتال کی گئی۔ فلمی اداکار دھرمیندر کی بیٹی ایشا دیول نے بھی اردو سیکھنے کی خواہش ظاہر کی ہے اور اس سلسلے میں کونسل کو اپنی درخواست بھی بھیج دی ہے۔ اردو کے تعلق سے حیرت اور مسرت کی بات تو یہ ہے کہ کونسل کو جو درخواستیں موصول ہوئی ہیں ان میں ساٹھ فی صد غیر اقلیتی فرقے کی طرف سے دی گئی ہیں۔ حالاں کہ اقلیتی فرقے میں بھی ایسے لوگوں کی اچھی خاصی تعداد ہے جو اردو سے بالکل نابلد ہیں۔ یہ حقائق اس بات کا ثبوت ہیں کہ اردو صرف مسلمانوں کی ہی نہیں بلکہ ایک بین فرقہ زبان ہے اور اب مختلف فرقوں اور طبقوں سے تعلق رکھنے والے افراد اردو سیکھ رہے ہیں۔ ایسی ہی ایک اردو پریمی ہیں مسز سونیا اور راجیو گاندھی کی صاحبزادی پرینکا۔ وہ بھی اردو سیکھ رہی ہیں اور ایک اطلاع کے مطابق جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی کے ایک استاد انھیں اردو پڑھا رہے ہیں۔ یہ ہے اردو کی بڑھتی ہوئی مقبولیت۔ **(قومی تنظیم، پٹنہ)**

یومِ اقبال کا انعقاد

● نئی دہلی، 10 نومبر۔ شاعرِ مشرق علامہ اقبال کی یومِ پیدائش پر منعقدہ ''اردو ڈے'' کے موقعے پر اردو والوں سے اپیل کی گئی کہ اردو کے حقیقی فروغ کے لیے وہ اپنی زبان سے محبت کا عملی ثبوت دیں اور اپنی تہذیب اور ثقافت کے تحفظ کے لیے اپنے بچوں کی اردو تعلیم و تدریس کا انتظام لازماً کریں۔

یونائیٹڈ مسلم آف انڈیا کے زیر اہتمام منعقدہ اس تقریب میں ریاستی حکومتوں سے مطالبہ کیا گیا کہ جن صوبوں میں اردو بولنے والوں کی اکثریت ہے اور جہاں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہے، وہاں سرکاری طور پر اردو ڈے کا اہتمام کیا جائے۔ اجلاس میں دہلی کے اردو میڈیم اسکولوں کے گرتے ہوئے معیار پر تشویش کا اظہار کیا گیا اور سرکار سے منظور تمام ہندی اور انگریزی

آمدنی سے ان کا ماہانہ گھریلو خرچ بہ مشکل پورا ہوتا تھا۔

شمیم بانو نے عرفان اور اس کے بھائی یوسف کو جو ایک آل راؤنڈر ہے اور بڑودا رنجی ٹیم سے کھیلتا ہے، کو کرکٹر بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

عرفان کے مطابق، اس کی والدہ کی مضبوط قوتِ ارادی نے تنگ دستی کے دنوں میں بھی انھیں آگے بڑھتے رہنے کا حوصلہ دیا۔ وہ مجھے حافظ بنانا چاہتی تھیں لیکن ابھی بھی میری حوصلہ افزائی کرتی ہیں کہ میں اپنی صلاحیتوں کے مطابق بہترین مظاہرہ کرسکوں۔ وہ میرے کھیل میں نہایت دلچسپی لیتی ہیں اور جب میں بہتر مظاہرہ نہیں کرپاتا ہوں تو وہ مایوس بھی ہوجاتی ہیں۔ جب میں کسی دورے سے واپس آتا ہوں تو وہ مجھ سے پوچھتی ہیں کہ میں ان کے لیے کتنی وکٹیں لے کر آیا ہوں۔

عرفان نے کامیابی حاصل کرنے کے لیے ایک لمبا سفر طے کیا ہے۔ اس وقت سے جب اس کے والد نے کرکٹ کھیلنے کے لیے اسے پلاسٹک کی گیندیں، سستے بلے، پرانے جوتے دیے۔ پھر اس کے چچا احمد، کوچ اور شہر کے دوسرے سینئر کھلاڑیوں نے کرکٹ کھیلنے کے لیے سے کرکٹ کٹ مہیا کرائی۔ حقیقتاً انڈر 15 کرکٹ کھیلنے کے بعد ہی اسے پہلی کرکٹ کٹ نصیب ہوئی۔ اور اب عرفان کا ارادہ اور خواہش یہ ہے کہ جہاں تک اس سے ممکن ہو، وہ تیز رفتار اور صحیح لائن کے ساتھ بالنگ کرسکے اور اپنی ٹیم کی جیت میں اہم رول ادا کرسکے۔

میڈیم کے اسکولوں میں اردو کو بطور مضمون شامل کرنے کا مطالبہ نیز پبلک اسکولوں سے اردو کو اپنے نصاب میں شامل کرنے کی درخواست کی گئی۔

علامہ اقبال کے 127 ویں یوم پیدائش پر منعقدہ اس اجلاس کی صدارت دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے سابق صدر پروفیسر عبدالحق نے کی۔ اس موقعے پر صحافی معصوم مرادآبادی اور پرواز رحمانی، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے پروفیسر شفیق ندوی اور ڈاکٹر خالد محمود کے علاوہ ڈاکٹر سید فاروق اور رام پرکاش کپور نے بھی علامہ اقبال، اردو کی صورت حال اور اس کے مسائل پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ (قومی آواز، نئی دہلی)

● بنگلور، 20 راکتوبر۔ ایثار پبلشنگ ہاؤس ٹرسٹ بنگلور کی جانب سے علامہ اقبال کی یوم پیدائش کے موقعے پر ایک مذاکرے کا انعقاد ہوا جس کے آغاز میں جناب سید احمد ایثار کا کیا ہوا ''جاوید نامہ'' کا مکمل منظوم اردو ترجمہ مع متن کا اجرا پروفیسر بی شیخ علی کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ پروفیسر بی شیخ علی نے اس موقعے پر خطاب کرتے ہوئے کہا کہ سید احمد ایثار نے ایک بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ جناب شیخ علی نے کہا کہ علامہ اقبال کا کلام ''جاوید نامہ'' ایک عالمگیر فلسفہ ہے اور اقبال نے اس میں زندگی کے رموز، عالم بالا کا ذکر، معراج کا ذکر اور انسانی زندگی کا فلسفہ پیش کیا ہے اور واضح کیا ہے کہ انسان کی ساری زندگی مہد سے لے کر لحد تک آزمائش ہے۔ اس سے قبل جناب اکمل آلدوری کی رباعیات وقطعات کے مجموعہ جادۂ اخلاص کا اجرا کرتے ہوئے ڈاکٹر عقیل ہاشمی نے کہا کہ گذشتہ 25 تا 30 برسوں سے اردو شاعری میں رباعیات کا سلسلہ ختم سا ہو گیا تھا اور جدید نظموں اور غزلوں کی جہاں بھرمار ہے ایسے ماحول میں رباعیات کہنا اور ان کا مجموعہ شائع کرنا دل گردے کا کام ہے۔

دوسری نشست میں اقبال کے کلام پر منعقدہ سمینار میں پروفیسر بی شیخ علی نے ''تہذیبوں کا تصادم اور اقبال'' ڈاکٹر عقیل ہاشمی نے ''فرزندانِ اسلام سے اقبال کی توقعات'' پروفیسر خالد عرفان نے ''سائنسی انکشافات اور اقبال کی پیش بینی'' جناب نریش ندیم نے ''اقبال کا فلسفہ اور کلام — ایک محاسبہ'' اور جناب وہاب عندلیب چیئرمین اردو اکادمی نے ''اقبال کا تصور وطنیت'' کے موضوعات پر مقالے پڑھے۔ پروفیسر آغا مرزا محمد سروش نے اس اجلاس کی صدارت کے فرائض انجام دیے۔ (سالار، بنگلور)

ذوق دہلوی پر مذاکرہ

● نئی دہلی، 3 دسمبر۔ انجمن ترقی اردو (دہلی) کے زیر اہتمام ایوان غالب، نئی دہلی میں ذوق دہلوی کی حیات اور کارناموں پر ایک روزہ سمینار منعقد ہوا جس کا افتتاح پروفیسر محمد حسن نے کیا اور صدارت ڈاکٹر تنویر احمد علوی نے کی۔ اس موقعے پر پروفیسر محمد حسن نے کہا کہ ذوق دہلوی پر اردو میں وہ کام نہیں ہوا، جس کے وہ مستحق تھے۔ ذوق کو غالب کے مقابلے کے شاعر کی طرح نہیں دیکھا جانا چاہیے بلکہ ذوق کا ان کے زمانے کی دہلی اور ماحول کے دائرے میں رکھ کر مطالعہ کیا جانا چاہیے۔ ذوق نے ساری زندگی دہلی میں رہ کر دہلی کی زبان، محاورہ اور روزمرّہ کا استعمال کیا۔ یہی ان کی عظمت ہے۔ اس موقعے پر ڈاکٹر خلیق انجم اور پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ ڈاکٹر تنویر احمد علوی نے ذوق کی شاعری، خصوصاً غزلوں اور قصیدوں پر روشنی ڈالی۔ سمینار میں جن مقالہ نگاروں نے اپنے مقالے پیش کیے ان میں پروفیسر شمیم حنفی، ڈاکٹر اسلم پرویز، پروفیسر شریف حسین قاسمی، پروفیسر عبدالمغنی، ڈاکٹر کاظم علی خاں، پروفیسر آفاق احمد، ڈاکٹر فیروز اور ڈاکٹر وسیم بیگم کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔ پروفیسر صادق اور پروفیسر عبدالحق نے جلسے کی صدارت فرمائی۔ محترمہ شہلا نواب اور جناب سرورالہدیٰ نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ (ڈاک سے)

ہریانہ اردو اکادمی میں ادبی مذاکرہ

● پنچکولہ۔ ''اردو صرف زبان ہی نہیں بلکہ ایک تہذیب ہے۔ اردو کی قواعد ہندستانی ہے لیکن اس کے ذخیرۂ الفاظ میں مختلف زبانوں کے الفاظ شامل ہیں۔ جب صورت حال یہ ہو تو الفاظ کہیں سے بھی آئیں، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ غزل اردو شاعری کی ایک ایسی صنف ہے، جس کی مقبولیت کا عالم یہ ہے کہ ہندستان کی دیگر زبانوں میں بھی غزلیں لکھی جارہی ہیں۔'' ان خیالات کا اظہار ممتاز شاعر اور ادیب ڈاکٹر نریش نے ہریانہ اردو اکادمی کی طرف سے منعقدہ مذاکرے بہ عنوان ''غزل کا سفر اور علاقائی زبانیں'' میں اپنے صدارتی خطاب میں کیا۔ اس سے قبل اکادمی کے سکریٹری جناب رمیندر جاکھو ساحل نے ادبی مذاکرے کے انعقاد کی غرض وغایت پر روشنی ڈالی اور کہا کہ اس کا مقصد زبانوں کو ایک دوسرے کے قریب لانا اور ان میں ادبی رشتے قائم کرنا ہے اور اس کے لیے غزل سے عمدہ کوئی ذریعہ نہیں ہوسکتا۔ اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ غزل کا کینوس اس قدر وسیع ہے کہ اس کے دو مصرعوں میں کچھ بھی سما سکتا ہے۔

علاقائی زبانوں کے تعلق سے اردو غزل پر معروف شاعر اور ادیب جناب کرشن کمار طور نے اظہار خیال کیا۔ ہندی غزل کے حوالے سے ہریانہ ساہتیہ اکادمی کے ڈائرکٹر اور مشہور صحافی وادیب ڈاکٹر چندر ترکھا نے کہا کہ غزل کی مقبولیت اس میں نہاں ہے کہ غزل انسانی جذبات کی بھرپور عکاسی ہوتی ہے۔ غزل کی خوبصورتی اس کے قافیہ اور ردیف میں ہے۔ اس لیے غزل کہتے ہوئے اور اسے اپناتے وقت اس کا خاص خیال رکھا جائے کہ غزل تکنیکی اعتبار سے مجروح نہ ہو۔

ہریانوی غزل پر ہندی کے ادیب وشاعر جناب مادھو کوشک نے اظہار خیال کیا۔ اس پروگرام کی نظامت اکادمی کے ایڈیٹر جناب شمس تبریزی نے کی۔ (ڈاک سے)

مولانا آزاد یونیورسٹی میں یوم آزاد تقریب

● حیدرآباد، 15 رنومبر۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے انچارج وائس چانسلر پروفیسر ایس اے وہاب نے کہا کہ مولانا ابوالکلام آزاد کا مطالعہ غیر معمولی طور پر وسیع اور متنوع تھا۔ کسی مواد یا متن کو ذہن نشیں کرنے کے لیے اُس کا ایک بار پڑھ لینا ہی مولانا آزاد کے لیے کافی تھا۔ پروفیسر وہاب نے ان خیالات کا اظہار اردو یونیورسٹی میں منعقدہ مولانا آزاد کی یوم پیدائش تقریب میں صدارتی خطبہ پیش کرتے ہوئے کیا۔ تقریب یوم آزاد سے خطاب کرنے والوں میں ٹرانسلیشن ڈویژن کے کوآرڈنیٹر ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال، پی آر او انچارج، ڈاکٹر محمد ظفرالدین، ڈاکٹر ریحانہ سلطانہ ڈی ایڈ یکیشن اور ڈی ایڈ سال دوم کے طلبہ محمد اکرام الباقی اور ناہید و بیگم شامل تھے۔

ڈاکٹر مصطفیٰ کمال نے کہا کہ مولانا آزاد بیک وقت کئی ہندستانی و عالمی زبانوں سے واقف اور ایک مخصوص مشترکہ کلچر کے نمائندہ تھے۔ ان کا یہ ماننا تھا کہ ملکی زبانوں کے توسط سے سائنس اور دوسرے علوم کی تعلیم حاصل کی جانی چاہیے، چنانچہ انھوں نے اردو میں علمی کتابوں کی اشاعت پر زور دیا تھا۔ اس مناسبت سے یہ کہنا بجا ہے کہ اردو یونیورسٹی کا نام ایک موزوں شخصیت سے منسوب ہے۔

ڈاکٹر محمد ظفرالدین نے کہا کہ مولانا آزاد بیک وقت قومی بیداری، علمی بیداری، تعلیمی بیداری اور کردار و اعمال کو شفاف بنانے کے لیے مذہبی بیداری کے داعی تھے۔ ڈاکٹر ریحانہ سلطانہ نے کہا کہ مولانا آزاد نے پہلے وزیر تعلیم کی حیثیت سے تعلیمی نظام کو بہتر بنانے پر خصوصی توجہ دی اور تکنیکی تعلیم کا رواج عام کرنے میں کلیدی کردار ادا کیا۔ (ڈاک سے)

جامعہ ملیہ اسلامیہ کے یوم تاسیس پر تقریبات

● نئی دہلی، 31 اکتوبر۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے یوم تاسیس کی تقریبات کے تحت نہرو ٹرافی اور گاندھی ٹرافی کے تحت مڈل اور سینئر سیکنڈری زمرے کے مختلف تعلیمی اور ثقافتی مقابلوں اور نمائشوں کا افتتاح ہوا۔ ''راشٹریہ سہارا'' اردو کے جوائنٹ ایڈیٹر جناب عزیز برنی نے ٹرافی کا افتتاح کرتے ہوئے تعلیم کی اہمیت اور ضرورت پر زور دیا اور خواتین سے اپیل کی کہ وہ اپنے نونہالوں کو بہترین تعلیم سے آراستہ کریں۔

اس موقعے پر منعقد ہونے والے مقابلوں میں نعت خوانی، نعتیہ قوالی، مونوایکٹنگ اور آن دی اسپاٹ پینٹنگ کے مقابلے خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ قرأت کے مقابلے میں جامعہ مڈل اسکول کے طالب علم حفظ الرحمٰن اور محمد ارشاد نے پہلی اور دوسری پوزیشن حاصل کی۔ مولانا ابوالکلام آزاد اسکول کے طالب علم محمد ابوبکر تیسرے نمبر پر رہے۔ نعت خوانی کے مقابلے میں جامعہ مڈل اسکول کی طالبہ صبوحی جاوید فرسٹ، گوڈس گریس اسکول کے بشریٰ اقبال سیکنڈ اور نیو ایرا اسکول کی طالبہ شائستہ خاں نے تیسری پوزیشن حاصل کی۔ نعتیہ قوالی میں جامعہ سینئر سیکنڈری اسکول سیکنڈ شفٹ کی ٹیم پہلے، ڈاکٹر ذاکر حسین ویلفیئر سوسائٹی کی طالبات دوسرے اور جامعہ مڈل اسکول کی ٹیم تیسرے نمبر پر رہی۔ مونوایکٹنگ میں ڈاکٹر ذاکر حسین سینئر سیکنڈری اسکول جعفرآباد اور نیو ایرا اسکول نے پہلی اور دوسری اور جامعہ مڈل اسکول نے تیسری پوزیشن حاصل کی۔ علاوہ ازیں گوڈس گریس 'نیو ہورائزن اور ڈاکٹر ذاکر حسین سینئر سیکنڈری اسکول جعفرآباد کو حوصلہ افزائی کے انعامات سے نوازا گیا۔ (راشٹریہ سہارا نئی دہلی)

اردو عربی کی مزاحمتی شاعری پر توسیعی خطبہ

● نئی دہلی، 5 رنومبر۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ عربی میں اردو اور عربی کی مزاحمتی شاعری پر پروفیسر محمد سلیمان اشرف نے اپنا مقالہ پیش کیا۔ انھوں نے ہندستان میں انگریزی سامراج کے تناظر میں اردو شاعری میں حالات کی بازگشت اور انقلابی رجحانات کی عکاسی کا جائزہ لیتے ہوئے بہادر شاہ ظفر، چکبست، ڈاکٹر اقبال، جوش ملیح آبادی، قاضی نذرالاسلام، روش صدیقی اور ظفر علی خاں وغیرہ کے کلام کے نمونوں کے ساتھ مزاحمتی شاعری کے ارتقا پر مبسوط گفتگو کی۔ انھوں نے سرزمین عرب میں رونما ہونے والے مختلف انقلابات اور ان کے تاریخی پس منظر اور ان کے ردِ عمل میں پروان چڑھنے والی مزاحمتی، باغیانہ اور انقلابی عربی شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے مصری شعرا حافظ ابراہیم، احمد محرم، شوقی، عراقی شاعر محمد مہدی الجواہری، فلسطینی شعرا محمود درویش اور فدوی طوقان کا نمایاں طور پر تذکرہ کیا۔

صدارتی تقریر کرتے ہوئے پروفیسر سید محمد اجتبیٰ ندوی نے فلسطینی انتفاضہ اور فلسطینی مزاحمتی شاعری پر اظہار خیال کیا۔ پروگرام میں شعبۂ عربی کے تمام اساتذہ اور ریسرچ اسکالر، طلبہ اور طالبات نے شرکت کی۔ آخر میں صدر شعبۂ عربی پروفیسر زبیر احمد فاروقی نے مقالہ نگار اور حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ پروگرام کی نظامت ڈاکٹر فرحانہ صدیقی نے کی۔ (راشٹریہ سہارا نئی دہلی)

غالب اکادمی میں ہندی اور اردو افسانوں کی ایک شام

● نئی دہلی، 9 رستمبر۔ غالب اکیڈمی، نئی دہلی میں اردو ہندی کہانی کی ایک شام کا انعقاد کیا گیا جس میں ڈاکٹر نگار عظیم نے ''چکرویو''، ڈاکٹر راج کمار ملک نے ''ٹھیکرا''، انجم عثمانی نے ''ورثہ''، جوگندر پال نے ''سراغ''، ترنم ریاض نے ''میرا کے شیام''، ابن کنول نے ''نیا درندہ''، ڈاکٹر ثروت خاں نے ''مردانگی'' اور رتن سنگھ نے ''ایک ناؤ کے سوار'' کہانیاں سنائیں۔ ڈاکٹر علی جاوید، پروفیسر علی احمد

فاطمی اور ڈاکٹر عقیل احمد نے کہانیوں پر اظہار خیال کیا۔ اس موقعے پر پروفیسر قمر رئیس نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ اردو ہندی میں کہانیاں دو تین پیڑھیوں کے لوگ لکھ رہے ہیں۔ وہ تمام مسائل سے باخبر ہیں اور پوری شدت سے محسوس کرکے لکھ رہے ہیں۔ آج کی کہانی پیچیدہ ہوتی جارہی ہے۔ مسائل کو منعکس کرنے کی کوشش زیادہ کی جارہی ہے۔ ساری دنیا کے مسائل، اولڈ ایج کے مسائل، ٹین ایج کے مسائل، گھریلو زندگی کے مسائل کہانیوں میں پوری طرح منعکس ہورہے ہیں۔ نوجوان لکھنے والے باہر کی دنیا کو دیکھ رہے ہیں اور اپنی کہانیوں میں پیش کررہے ہیں۔ (قومی آواز، نئی دہلی)

کیریئر گائیڈنس پر نیشنل ورکشاپ

● علی گڑھ، 21 / اکتوبر۔ ''جس طرح ایک متنفس کے لیے جینے کی خاطر تنفس لازمی ہے اسی طرح ایک طالب علم اور اس کے کیریئر کے لیے آج گائیڈنس ضروری ہے۔ یہ خوشی کی بات ہے کہ طالب علم، ان کے سرپرست، انجمنیں، ادارے اور یہاں تک کہ جامعات بھی اپنے طلبہ کے لیے کیریئر گائیڈنس کا اہتمام کرنے لگی ہیں۔'' ان خیالات کا اظہار کیریئر گائیڈنس اینڈ کونسلنگ ایکسپرٹ ڈاکٹر سلمان عابد نے مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ میں منعقدہ کیریئر گائیڈنس ورکشاپ میں کیا جو طالب علموں بالخصوص بارھویں جماعت کے طالب علموں کے لیے تھا۔

ڈاکٹر سلمان عابد نے ''کیریئر گائیڈنس، نظریہ اور انطباق'' پر مقالہ پیش کیا۔

ورکشاپ کو آٹھ سیشن میں تقسیم کیا گیا جن میں چار سیشن لڑکوں کے لیے اور چار لڑکیوں کے لیے کینڈی ہال، کلچرل ہال، ویمنس کالج وغیرہ میں منعقد کیے گئے۔ PCM گروپ کے لیے کیریئر ان سائنس، PCB گروپ کے لیے کیریئر ان سائنس اور کیریئر ان ہیومینیٹیز کے علاوہ کیریئر ان کامرس کے عنوان پر الگ الگ سیشن رکھے گئے۔ ان سیشن میں کیریئر ان بائیوٹکنالوجی پر جناب معاذ حسین نے لیکچر دیا۔ اس ورکشاپ کا انعقاد جناب نسیم احمد، جناب سراج حسین (وائس چانسلر جامعہ ہمدرد) ڈاکٹر پرویز طالب (ڈائرکٹر کوچنگ اینڈ گائیڈنس سینٹر) اور ڈاکٹر عمران سلیم کی مشترکہ مساعی کا نتیجہ تھا۔ اس ورکشاپ میں طلبہ کی دلچسپیاں، میلان، ذاتی صلاحیت، رجحان اور غالب رجحان معلوم کرنے کے لیے نفسیاتی امتحان منعقد کیے گئے، ان کی پرسنل کونسلنگ کی گئی، جنرل کیریئر لیکچر رکھے گئے اور سوال وجواب کے الگ الگ وسیع و وقیع سیشن رکھے گئے۔

اس قومی ورکشاپ کا افتتاح علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر جناب نسیم احمد نے کیا۔ اپنے خطاب میں وائس چانسلر نے طالب علموں سے کہا کہ آپ خوش قسمت ہیں کہ آپ کے سامنے ہزار راستے ہیں اور کئی راہبر۔ میرے اسکول کے زمانے میں مجھے کچھ پتہ نہ تھا اور نہ کوئی راہبر کہ کس راستے پر چلیں، یہ بتا سکے۔ انھوں نے کہا کہ آج ملازمتیں کم سے کم ہورہی ہیں اور مسابقت زیادہ سے زیادہ ہوگئی ہے۔ انھوں نے اس ضمن میں طالب علموں سے کہا کہ آپ کو کئی Challenges کا سامنا ہے۔ آپ کو چاہیے کہ آپ اپنے چیلنجوں سے واقف ہوں اور ان کے لیے پلان اور عمل کریں۔ اس سلسلے میں انھوں نے طلبہ کو اپنی اندرونی صلاحیتوں کے پیش نظر مناسب وموزوں کیریئر اپنانے کا مشورہ دیا۔

ممتاز صنعت کار BITS اور IIM کے فارغ التحصیل سابق نائب صدر جمہوریہ ہند آنجہانی جناب کرشن کانت کے داماد مسٹر سنیل ہانڈا (احمد آباد) نے طالب علموں کو مشورہ دیا کہ وہ اپنی اندرونی صلاحیتوں اور استعداد کو پہچانیں اور انھی Directions میں صحیح کیریئر کا انتخاب کریں۔

ڈاکٹر پرویز طالب نے اپنے خطاب میں کہا کہ اس ورکشاپ کے ذریعے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے طالب علموں میں کیریئر کی نئی منزلوں تک جست بھرنے میں مدد ملے گی۔ ابتدا میں پرنسپل (بوائز سیکشن) جناب افتخار احمد نے ورکشاپ کے اغراض ومقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ صحیح کیریئر ہی اگلی زندگی کے لیے کارآمد اور قابل ذکر ہوگا۔ تقریب کی کارروائی بارھویں کی طالبہ زہرہ نقوی نے انجام دی جبکہ شکریہ جناب ممتاز حسین نے ادا کیا۔ (ڈاک سے)

رشید حسن خاں کو مدھیہ پردیش اردو اکادمی کا راجا رام موہن رائے ایوارڈ

● اردو کے ممتاز محقق جناب رشید حسن خاں کو ان کی مجموعی خدمات پر مدھیہ پردیش اردو اکادمی کے پہلے راجا رام موہن رائے ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا ہے۔ رشید حسن خاں یہ انعام حاصل کرنے والے اردو کے پہلے محقق اور ادیب ہیں۔ یہ انعام ایک لاکھ، پچیس ہزار روپے اور ایک توصیفی سند پر مشتمل ہے۔

جناب رشید حسن خاں کا شمار اردو کے محققین اربعہ میں حافظ محمود شیرانی، قاضی عبدالودود اور مولانا امتیاز علی خاں عرشی کے ساتھ ہوتا ہے۔ خاں صاحب آج بھی ایک زندہ روایت کے طور پر آئندہ نسلوں کے لیے اردو کے کلاسیکی متون مرتب کررہے ہیں۔ ان کے معرکتہ الآرا تحقیقی کارناموں میں ''باغ و بہار''، ''فسانۂ عجائب''، ''گلزار نسیم''، ''سحرالبیان''، ''کلیات جعفر زٹلی'' کے مبسوط مقدموں کے ساتھ مستند متون اور ''مصطلحات ٹھگی'' اور ''کلاسیکی ادب کی فرہنگ'' وغیرہ شامل ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے اردو املا کی معیار بندی کا سب سے اہم اور ضخیم دستاویز ''اردو املا'' کے عنوان سے مرتب کیا، نیز ''زبان اور قواعد''، ''ادبی تحقیق: مسائل اور تجزیہ''، ''انشا اور تلفظ''، ''املائے غالب'' اور ''انشائے غالب'' جیسے اہم موضوعات پر بھی انھوں نے مبسوط کتب تحریر کی ہیں۔ علاوہ ازیں رشید حسن خاں صاحب نے مکتبہ جامعہ، نئی دہلی کی معیاری کتب سیریز کے تحت درد، سودا، ناسخ، نظیر اکبرآبادی کے کلام کا انتخاب، انتخاب مراثی انیس و دبیر اور انتخاب شبلی بھی مرتب کیا۔ یہ کتابیں آج بھی اردو ادب کے طالب علموں کے

مطالعات کی راہوں کو منور کرتی ہیں۔ ان کے مضامین کے دو مجموعے "تلاش و تعبیر" اور "تفہیم" بھی منظر عام پر آچکے ہیں۔ (ڈاک سے)

غالب انعامات

● نئی دہلی، مورخہ 3 دسمبر۔ غالب انسٹی ٹیوٹ ہر سال معتبر ادیبوں، دانشوروں، شاعروں اور ڈرامہ نگاروں کو غالب انعامات دیتا ہے۔ اس سال غالب انسٹی ٹیوٹ کی ایوارڈ سب کمیٹی کی میٹنگ مورخہ 11 نومبر 2003 کو پروفیسر نذیر احمد کی صدارت میں منعقد ہوئی جس میں مندرجہ ذیل دانشوروں کو غالب انعامات برائے سال 2003 منتخب کیا گیا۔

فخرالدین علی احمد غالب انعام برائے اردو تنقید و تحقیق، پروفیسر خورشید الاسلام (علی گڑھ)، فخرالدین علی احمد غالب انعام برائے فارسی تنقید و تحقیق، پروفیسر شریف حسین قاسمی (دہلی)، غالب انعام برائے اردو شاعری، جناب عرفان صدیقی (لکھنؤ)، غالب انعام برائے اردو نثر، پروفیسر نیر مسعود (لکھنؤ)، ہم سب غالب انعام برائے اردو ڈرامہ، جناب اقبال مجید (بھوپال)، غالب انعام برائے مجموعی ادبی خدمات، جناب رتن سنگھ (نوئیڈا)۔ یہ انعامات مبلغ 25 ہزار روپے نقد، ایک تمغا اور سند پر مشتمل ہیں۔ (ڈاک سے)

یوپی اردو اکیڈمی کے چیئرمین مستعفی

● سنبھل، 18 نومبر۔ چند ماہ قبل ہی منتخب ہوئے اردو اکادمی اتر پردیش کے چیئرمین حاجی اعظم قریشی نے اپنے عہدے سے مستعفی ہونے کا اعلان کیا ہے۔ ایک پریس کانفرنس میں انھوں نے بتایا کہ وزیر اعلا ملائم سنگھ یادو کو بذریعہ فیکس مستعفی ہونے کی اطلاع بھیج دی گئی ہے۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

مختصرات

● پٹنہ، 28 اکتوبر۔ ڈاکٹر انور ایرج شعبۂ اردو، ڈی ایس کالج، کٹیہار کو ان کی ادبی اور سماجی خدمات کے لیے لوک سیوا کمیٹی جھارکھنڈ، رانچی کے زیر اہتمام 28 اکتوبر 2003 کو جھارکھنڈ رتن ایوارڈ سے نوازا گیا۔ ڈاکٹر انور ایرج ایک مخلص انسان، ایک اچھے شاعر اور نقاد کی حیثیت سے ادبی دنیا میں ایک پہچان بنا چکے ہیں۔ اس موقعے پر جناب انور ایرج کو سمن زار ادب، سمن پورہ، پٹنہ کی جانب سے ایک استقبالیہ دیا گیا جس کی صدارت جناب عطا عابدی نے کی۔ اس میں ڈاکٹر عبید الرحمٰن، رجسٹرار کنٹرولر مولانا آزاد اردو یونیورسٹی، پٹنہ، ڈاکٹر محمد احسن اسسٹنٹ رجسٹرار کنٹرولر اردو یونیورسٹی، عطا عابدی سیکشن آفیسر بہار ودھان پریشد، ڈاکٹر زبیر بھاگلپوری، آصف سلیم، شہنشاہ عالم، منیر سیفی، اسرار جامعی، تمنا مظفرپوری وغیرہ نے اظہار خیال کیا۔ (ڈاک سے)

● ممتاز بیگم محسن میر معلمہ گورنمنٹ اردو ماڈل گرلز اسکول، دہلی کو ان کی قابل قدر خدمات برائے تعلیم، اصولی زندگی اور مسلسل محنت کو مدنظر رکھتے ہوئے کرناٹک اسٹیٹ گورنمنٹ کی جانب سے منعقدہ ٹیچرز ڈے تقریب میں عزت مآب گورنر ریاست کرناٹک نے اسٹیٹ ایوارڈ سے نوازا۔ (ڈاک سے)

● آکولہ۔ مسلم دلت بہوجن پریشد (آکولہ) نے بچوں کے پندرہ روزہ "ایپل ورلڈ" کے مدیر اور فلم رائٹر ایس خاں کو تعلیمی اور ادب اطفال کے میدان میں اُن کی گرانقدر خدمات کے صلے میں "مولانا ابوالکلام آزاد ایوارڈ" اور توصیفی سند سے نوازا۔ (ڈاک سے)

● تروچی، 18 اکتوبر۔ جمال محمد کالج کی لڑکیوں کے سیکشن کے دوسرے جلسۂ تقسیم اسناد کے موقعے پر 10 اکتوبر کو نیشنل اسسمنٹ اینڈ اکریڈیٹیشن کونسل، بنگلور کی ایڈوائزر ڈاکٹر لتا ناتھن نے طالبات سے خطاب کیا اور گریجویٹس کو ڈگریاں تقسیم کیں۔ اس پروگرام میں کمپیوٹر اپلی کیشن اینڈ ملٹی لنگول ڈی.ٹی.پی. کے سیشن 03-2002 کی کامیاب 21 طالبات کو بھی ڈپلوما تفویض کیے گئے۔ ڈاکٹر لتا ناتھن نے کہا کہ تعلیم یافتہ عورتوں پر قومی ترقی کی کارروائیوں میں حصہ لینے کی زیادہ ذمے داریاں عائد ہوتی ہیں اور آج کی عورت مجبور و لاچار نہیں ہے بلکہ تعلیم حاصل کر کے زیادہ سے زیادہ روشن دماغ ہو رہی ہے۔

لڑکوں کے لیے سالانہ جلسۂ تقسیم اسناد 17 اکتوبر کو منعقد کیا گیا۔ یونیورسٹی گرانٹ کمیشن کے وائس چیئرمین ڈاکٹر راجا سیکرن پلئی نے طلبہ کو ڈگریاں تقسیم کیں اور انھیں خطاب کیا۔ اس موقعے پر ڈپلوما ان کمپیوٹر اپلی کیشن اور ملٹی لنگول ڈی ٹی پی کے 31 کامیاب طلبہ کو ڈپلوما تفویض کیے گئے۔ (ڈاک سے)

● برہانپور، 18 اکتوبر۔ نیشنل اردو اسکول میں مدھیہ پردیش مسلم ایجوکیشنل سوسائٹی کی جانب سے 8 سال کی عمر تک کے بچوں کے لیے جنرل نالج ٹیسٹ کا انعقاد ہوا جس میں برہانپور کے سبھی پرائمری اسکول کے طلبہ نے شرکت کی جس میں بطور جج مفتی محمد علی، محمد ابوالحسن اشرفی، قاری خلیل الرحمان موجود تھے۔ انھوں نے بچوں سے سوالات کیے جن میں جونیئر گروپ میں ارم ناز۔ قادریہ اسکول، مدیحہ کوثر۔ ماڈرن مدرسہ ابوہریرہ، بلقیس۔ کنڈرگارڈن اردو اسکول اور سینئر گروپ میں جا مبین۔ اردو اسکول نمبر 3، سعید احمد۔ ماڈرن مدرسہ ابوہریرہ اور سعد افضال۔ ماڈرن مدرسہ ابوہریرہ کو انعامات ایم ایل اے منجو شری کے ہاتھوں دیے گئے۔ (ڈاک سے)

● گورنمنٹ کالج چتوڑ کے شعبۂ اردو میں مولانا ابوالکلام آزاد کی یاد میں ایک خصوصی تقریب منعقد کی گئی جس کی صدارت سید وصی اللہ بختیاری، لکچرر شعبۂ اردو نے کی۔ انھوں نے اپنے کلیدی خطبے میں مولانا ابوالکلام آزاد کا بحیثیت عالم دین، صحافی، مجاہد آزادی، سیاست داں، مفسر قرآن وغیرہ مختلف جہتوں سے تعارف کرایا۔ مہمان خصوصی جناب محمد تقی اللہ خاں نے قومی یوم تعلیم کی مناسبت

سے مولانا آزاد کے تعلیمی نظریات پر روشنی ڈالی۔ جلسے میں محمود پاشا، شہناز بیگم، ارشد احمد، شاہدہ بی، نجمہ تارا نے تصانیف کا تعارف کرایا اور شمیم بانو نے اظہار خیال کیا۔ آخر میں وصی اللہ بختیاری نے اختتامی تقریر کی۔ (ڈاک سے)

● اچلپور، 11 رنومبر۔ شعبۂ اردو جگدمبا مہاودیالیہ کی جانب سے مولانا ابوالکلام آزاد کی یومِ ولادت پر ''یومِ اردو'' منایا گیا۔ اس کے تحت اچلپور شہر کے عوام سے اپیل کی گئی کہ 11 رنومبر کو یومِ اردو منائیں۔ کالج کے پرنسپل ڈاکٹر اے۔ کے۔ بکرجی اور مینجمنٹ کے صدر جناب شنکر راؤ نے اس پروگرام کے انعقاد کے لیے ہمت افزائی کی۔ ان پروگراموں کے ذریعے بچوں کو اردو پڑھنے کی طرف راغب کیا گیا اور غیر اردو داں طبقے سے بھی اردو پڑھانے میں تعاون کی درخواست کی گئی۔ (ڈاک سے)

رسمِ اجرا

دیوانِ اشرف علی خاں فغاں

● نئی دہلی، 19 رنومبر۔ قومی اردو کونسل کی شائع کردہ ''دیوانِ اشرف علی خاں فغاں'' (مرتبہ۔ سرورالہدیٰ) کا اجرا پروفیسر شمیم حنفی نے کیا۔ جلسے کی صدارت ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ، ڈائرکٹر قومی اردو کونسل نے کی۔ انھوں نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ اردو زبان کو موجودہ ٹیکنالوجیکل منظرنامے سے جوڑنے اور سائنسی اور علمی مضامین پر کتابوں کی اشاعت کے ذریعے اس کے دامن کو وسیع کرنے کی ضرورت ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ کلاسیکی ادب ہمارا قیمتی ورثہ ہے اور یہ ہم سب کا فرض ہے کہ اس ورثے کی حفاظت کریں۔ قومی اردو کونسل اس سلسلے میں بے حد سنجیدہ کوششیں کر رہی ہے اور ایک بڑے پروجیکٹ کے تحت تمام کلاسیکی متون کی ترتیب و تدوین پر کام جاری ہے۔ گزشتہ دو تین مہینوں میں دیوانِ درد، کلیاتِ ذوق، دیوانِ اشرف علی خاں فغاں اور کلیاتِ اکبر الٰہ آبادی شائع ہو چکے ہیں اور جلد ہی کئی اہم کلاسیکی کتابیں منظرِ عام پر آنے والی ہیں۔

مقررین میں پروفیسر شمیم حنفی، پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی، پروفیسر عتیق اللہ، پروفیسر مینجر پانڈے، پروفیسر نثار احمد فاروقی، ڈاکٹر اسلم پرویز، ڈاکٹر انور پاشا کے نام شامل ہیں۔ اس موقعے پر شعبے کے اساتذہ اور طلبہ کی بڑی تعداد موجود تھی۔ مہمانِ خصوصی پروفیسر نثار احمد فاروقی نے تحقیق کے اصول، آداب اور اس کی ضرورت پر روشنی ڈالی۔ پروفیسر شمیم حنفی نے کہا کہ ہمارے طلبہ عموماً متن نہیں پڑھتے، متن کے بارے میں پڑھتے ہیں۔ ایسے حالات میں ایک نوجوان طالب علم کا ایک کلاسیکی شاعر کا دیوان مرتب کرنا اور اس پر ایک اچھا مقدمہ لکھنا مرتب اور ادب دونوں کے لیے خوش آئند ہے۔ ہندی کے ممتاز نقاد اور دانشور پروفیسر مینجر پانڈے نے فغاں کے عہد اور ان کی شاعری پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ فغاں ایک ایسے دور میں پیدا ہوئے جس نے ہندستان کی تاریخ کے آئندہ ڈھائی سو برسوں کی سمت متعین کی۔ ان کا کلام سنجیدگی سے پڑھنے کی ضرورت ہے۔ اس موقعے پر تمام مقررین نے ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ کی تعریف کرتے ہوئے ان کا شکریہ ادا کیا کہ ان کی علم دوستی اور فعالیت کی وجہ سے بہت سی نایاب اور اہم کتابیں شائع ہو رہی ہیں۔ اخیر میں ڈاکٹر مظہر مہدی نے شکریہ کی رسم ادا کی اور نظامت کے فرائض ڈاکٹر آفتاب احمد آفاقی نے انجام دیے۔ (ڈاک سے)

ماہنامہ ''قومی زبان''

● حیدرآباد، 20 راکتوبر۔ اردو اکادمی آندھرا پردیش کے ماہنامہ جریدے ''قومی زبان'' کی رسمِ اجرا ڈاکٹر سید عبدالمنان صدر انجمن ترقی اردو، آندھرا پردیش نے انجام دی۔ جناب ابراہیم بن عبداللہ مسقطی صدرنشین اردو اکادمی نے پروگرام کی صدارت کی۔ تقریب میں ڈاکٹر سی نارائن ریڈی سابق ایم پی، صدرنشین وقف بورڈ مسٹر محمد سلیم، جسٹس سردار علی خاں سابق صدرنشین مرکزی اقلیتی کمیشن اور پروفیسر مغنی تبسم معتمد عمومی، ادارہ ادبیات اردو نے مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی۔

تقریب میں جناب منظورالامین، ڈاکٹر حسن الدین احمد، انصر بیگ، علی ظہیر، ڈاکٹر اشرف رفیع، پروفیسر سلیمان اطہر جاوید، آنند راج ورما، ڈاکٹر ایم۔ ایل۔ نگم، علاء الدین انصاری ایڈووکیٹ، حبیب عبدالرحمٰن الحامد، کبیر احمد، شاہد حسین کے علاوہ بورڈ آف ڈائرکٹرس میں شری منوہر راج سکسینہ، محترمہ لکشمی دیوراج، سلیم عابدی، رحیم اللہ خاں نیازی اور دیگر حضرات نے شرکت کی۔ (ایکشن، بھوپال)

یادوں کے جگنو

● کولکاتہ، 20 رستمبر۔ مسلم انسٹی ٹیوٹ لٹریری سب کمیٹی کے زیرِ اہتمام نئی نسل کے شاعر و ادیب نعیم انیس کی چوتھی کتاب ''یادوں کے جگنو'' (رپورتاژ) کی رسمِ اجرا عمل میں آئی۔ جس میں پروفیسر سلیمان خورشید نے استقبالیہ تقریر میں نعیم انیس کی شخصیت اور فن پر روشنی ڈالی۔ افتتاحی تقریر میں پروفیسر اعزاز افضل نے کتاب کی اشاعت پر نعیم انیس کو مبارک باد دی۔ کتاب کی رسمِ اجرا معروف افسانہ نگار انیس رفیع کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ اردو یونیورسٹی کے کلکتہ اسٹڈی سینٹر سے وابستہ سال سوم کی طالبہ شائستہ پروین نے نعیم انیس کی شخصیت اور ان کی علمی مصروفیت پر روشنی ڈالی۔

پروفیسر مشتاق اعظمی نے ایک مقالہ بعنوان ''یادوں کے جگنو — ایک کامیاب رپورتاژ'' پیش کیا۔ صدرِ محفل قیصر شمیم، وائس چیئرمین مغربی بنگال اردو اکادمی اور سہ ماہی ادبی جریدے ''مژگاں'' کے مدیر نوشاد مومن نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

اس موقعے پر کتاب کے مصنف نعیم انیس نے تمام افراد کا شکریہ ادا کیا۔ بزرگ شاعر جناب علقمہ شبلی اور مسلم انسٹی ٹیوٹ لٹریری سب کمیٹی کے چیئرمین انجم عظیم آبادی نے نعیم انیس کے فن پر روشنی ڈالتے ہوئے انھیں مبارک باد دی۔ تقریب کی نظامت ممتاز شاعرہ شگفتہ یاسمین غزل نے کی۔ (ڈاک سے)

بچوں کا انسائیکلو پیڈیا

● مالیگاؤں، 26 / اکتوبر۔ ادارہ بزمِ اطفال کی دسویں کتاب ''بچوں کا انسائیکلو پیڈیا'' کا اجرا عنتا کو آپریٹو بینک لمیٹڈ کے وائس چیئر مین ڈاکٹر شفیق احمد کے دستِ مبارک سے ہوا۔ صدارت مولانا آزاد ریسرچ سینٹر کے صدر جناب عبدالحمید ازہری نے کی۔ اس موقعے پر ڈاکٹر الیاس صدیقی، جناب اسحاق خضر، مولانا محمد ادریس عقیل ملّی، انصاری محمد غفران اور ایم یوسف انصاری نے کتاب کے حوالے سے اظہارِ خیال کیا۔

پروگرام کا دوسرا حصہ جنرل نالج انعامی مقابلوں کے تقسیم انعامات پر مشتمل تھا جس میں انعام یافتگان کو انعامات سے نوازا گیا۔ اس پروگرام کی نظامت کے فرائض جلیس الرحمٰن ملّی نے انجام دیے۔ اس پروگرام کے دیگر مہمانان میں حکیم حافظ غلام ربانی، مسعود اختر، ڈاکٹر اخلاق احمد، انصاری عبدالطیف، حاجی خورشید پہلوان، عبدالرحمٰن، شریف، رفیع احمد، حاجی شفیق احمد، کے ایف انصاری وغیرہ شامل تھے۔ (ڈاک سے)

جانے والوں کی یاد

بیگم عابدہ احمد

● نئی دہلی، 7 / دسمبر۔ سابق صدر جمہوریہ فخرالدین علی احمد کی اہلیہ اور سابق ممبر پارلیمنٹ بیگم عابدہ احمد کا انتقال ہوگیا۔ وہ 80 برس کی تھیں۔ پسماندگان میں ایک بیٹی اور دو بیٹے ہیں۔ 7 / دسمبر کی شام تقریباً چار بجے اپولو اسپتال میں ان پر دل کا دورہ پڑا جو جان لیوا ثابت ہوا۔ ان کی تدفین 9 / دسمبر کو پارلیمنٹ اسٹریٹ کی مسجد کے احاطے میں ان کے شوہر کی قبر کے قریب ہوئی۔ درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیا کے سجادہ نشیں خواجہ حسن ثانی نظامی نے نماز جنازہ پڑھائی۔ اس موقعے پر شہر کی اہم سیاسی، سماجی و ادبی شخصیتوں کی کثیر تعداد موجود تھی۔ بعد ازاں مرحومہ کی لحد پر صدر جمہوریہ اے پی جے عبدالکلام، صدر کانگریس محترمہ سونیا گاندھی، سابق وزرائے اعظم چندر شیکھر اور اندر کمار گجرال کی جانب سے پھولوں کی چادریں چڑھائی گئیں۔

بیگم عابدہ احمد متعدد اداروں سے وابستہ تھیں اور غالب انسٹی ٹیوٹ کے بنیادی ممبروں میں شامل رہی تھیں۔ وہ گزشتہ 20 برسوں سے غالب انسٹی ٹیوٹ کی چیئرمین تھیں۔ وہ دو بار بریلی سے ممبر پارلیمنٹ منتخب ہوئیں۔ بہت سے فلاحی کارنامے انجام دیے اور ایک زمانے سے وہ مہیلا امداد کمیٹی کی چیئر پرسن بھی تھیں۔ ان کا گھرانہ اردو کا ایک علمی گھرانہ تھا۔ ان کے والد سلطان حیدر جوش اردو کے مشہور افسانہ نگار تھے۔ بیگم عابدہ احمد کا اردو ثقافتی حلقے سے گہرا تعلق رہا اور انھوں نے ''ہم سب ڈراما گروپ'' بنا کر گزشتہ پچیس برسوں میں بے شمار اردو ڈرامے پیش کیے۔ ان کے اچانک انتقال پر غالب انسٹی ٹیوٹ، اردو اکادمی دہلی، انجمن ترقی اردو اور دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں تعزیتی جلسوں کا انعقاد ہوا اور ان کی ادبی و ثقافتی خدمات کا اعتراف کیا گیا۔

کفیل آزر

● 28 / نومبر کی شام کو مشہور شاعر کفیل آزر کا ان کے آبائی شہر امروہہ میں دل کا دورہ پڑنے سے انتقال ہوگیا۔ انتقال کے وقت ان کی عمر لگ بھگ 65 سال تھی۔

کفیل آزر 60 کی دہائی میں ابھرنے والے ان شاعروں کی نسل سے تعلق رکھتے تھے جو جدیدیت کے رجحان سے متاثر تھے لیکن اُن کی ذہنی پرورش و پرداخت کلاسیکی ماحول میں ہوئی تھی اور اس میں کچھ اثرات ترقی پسند تحریک کے بھی شامل رہے تھے۔ اپنی ذہنی نشو و نما کے ابتدائی ایّام ہی میں وہ امروہہ کو خیر باد کہہ کر ممبئی چلے گئے تھے، جہاں کے ادبی ماحول پر ابھی تک ترقی پسندوں کا غلبہ تھا اور علی سردار جعفری، مجروح سلطانپوری، ساحر لدھیانوی اور کیفی اعظمی جیسے شاعروں کی آوازیں وہاں کی فضا میں گونج رہی تھیں۔ ایک نوجوان شاعر کا ان بڑی آوازوں سے متاثر ہونا بعید از قیاس نہ تھا۔ وہ سب سے زیادہ متاثر ساحر لدھیانوی سے ہوئے جو اس دور کے نوجوانوں کے محبوب ترین شاعر تھے۔ ساحر کا اثر ان پر آخر تک رہا لیکن انھوں نے اپنی شاعری کو ساحر کی صدائے بازگشت بن جانے سے محفوظ رکھا جو ان کے فطری شاعر ہونے کی دلیل ہے۔

ممبئی پہنچ کر وہ کمال اسٹوڈیو سے وابستہ ہوگئے تھے۔ اس اسٹوڈیو کے مالک اور ان کے ہم وطن فلمساز کمال امروہوی نے تو اپنی کسی فلم کے گانے ان سے نہیں لکھوائے لیکن بعض دوسرے فلمسازوں کی فلموں کے لیے انھوں نے گیت بھی لکھے اور مکالمے بھی۔ ان کی ایک نظم: بات نکلے گی تو پھر دور تلک جائے گی، گلوکار جگجیت سنگھ کی آواز میں بہت مقبولیت حاصل کر چکی ہے۔

کفیل آزر غزل اور نظم دونوں اصناف پر قادر تھے اور انھوں نے قطعے بھی کہے ہیں۔ ان کی اکثر نظمیں بھی ساحر کی نظموں کی طرح قطعہ بند ہیں لیکن انھوں نے کچھ مختصر مختصر نظمیں بھی کہی ہیں، جیسے ان کی یہ نظم جو صرف تین مصرعوں پر مشتمل ہے، ادبی حلقوں میں کافی سراہی گئی تھی:

رات، سورج تھا میرے ہاتھوں میں
صبح کو، سوچتا ہوں، کس سے کہوں
کون آئے گا میری باتوں میں

کفیل آزر کی غزلیں روایتی رکھ رکھاؤ کے ساتھ ساتھ عصری حسیت سے بھی مملو ہیں۔ وہ زود حس تھے اور ماحولی کیفیات سے بہت جلد متاثر ہو جایا کرتے تھے۔ اپنے ایک شعر میں انھوں نے آج کے انسان کے دہرے کردار پر کیسا بھرپور طنز کیا ہے:

ہر چہرے پر خول چڑھا ہے اور کسی کے چہرے کا
کس کو کس کے نام سے جانیں کس کی کیا پہچان کریں

ممبئی کو خیر باد کہنے کے بعد وہ مستقل طور پر دتی آبسے تھے لیکن ان کا شہر انھیں متواتر اپنی طرف کھینچتا رہتا تھا اور آخر وہیں کی خاک میں وہ ہمیشہ کے لیے جا سوئے۔

تبصرہ و تعارف

کلیاتِ پریم چند (جلد 4) / مرتب: مدن گوپال

صفحات: 721، قیمت: 227/- روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1

آر. کے. پورم، نئی دہلی-67

مبصر: علاء الدین خاں

پریم چند کو بحیثیت ناول نگار اور افسانہ نگار کے اردو ادب میں بڑا مقام حاصل ہے۔ پریم چند کی ادبی قدر و قیمت کے مدِ نظر قومی اردو کونسل ان کی تمام تحریروں کو ایک بڑے منصوبے کے تحت ''کلیاتِ پریم چند'' کے نام سے ایک مکمل سیٹ کی شکل میں شائع کر رہی ہے جس میں پریم چند کے ناول، افسانے، ڈرامے، خطوط، تراجم، مضامین اور اداریے شامل ہیں۔ کلیاتِ پریم چند کی زیرِ نظر جلد اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

پریم چند کے جو ناول اولاً اردو میں لکھے گئے ان میں آخری ناول ''چوگانِ ہستی'' ہے۔ کلیاتِ پریم چند کی یہ چوتھی جلد اسی ناول پر مشتمل ہے۔ اس کے بعد انھوں نے اپنے تمام ناول اولاً ہندی میں لکھے جنھیں بعد ازاں اردو کے قالب میں منتقل کیا گیا۔ اس ناول کی تصنیف اکتوبر 1922 میں شروع ہوئی اور یکم اپریل 1924 کو اس کی تکمیل ہوئی۔ لیکن اس کی اشاعت اس کے ہندی ایڈیشن ''رنگ بھومی'' کی اشاعت (1925) کے تین برس بعد 1928 میں دارالاشاعت لاہور سے ہوئی۔

''چوگانِ ہستی'' کا پس منظر ہندستان کی تحریکِ آزادی ہے۔ ناول کی تشکیل سورداس اور جان سیوک کے مابین سورداس کی پرتی پڑی زمین کو لے کر پیدا ہونے والی کشمکش سے ہوئی ہے۔ سورداس زمین کو اپنے آبا و اجداد کی آخری نشانی مان کر اسے ہر حال میں جان سیوک سے بچانا چاہتا ہے جو کسی بھی طرح اس زمین کو کارخانہ لگانے کے لیے حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اس ناول میں پریم چند نے سورداس کے ذریعے گاندھی جی کے خیالات اور عدم تشدد کے نظریے کی تشہیر کی ہے۔ سورداس ناول کا مرکزی کردار ہے جو نابینا ہے مگر وہ چشمِ باطن سے سب کچھ دیکھتا ہے۔ سورداس اور اس کی جدوجہد کی عکاسی کرتے ہوئے انھوں نے ناول میں تحریکِ آزادی کی جھلک بھی دکھادی ہے۔ پریم چند نے رمز و اشارے سے کام لے کر حقیقی سماجی، معاشی اور تاریخی صداقتوں کو پیش کیا ہے۔ ناول میں پریم چند نے ہر جگہ تاریخی حقائق سے کام لیا ہے اور اس کے ذریعے ناول کی فضا تیار کی ہے۔

سورداس ایک مثالی کردار ہے جو ناول پر چھایا ہوا ہے۔ اس کے اندر مہاتماؤں اور دیوتاؤں جیسی صفات موجود ہیں۔ اگر کوئی اسے نقصان پہنچانے کی کوشش کرتا ہے تب بھی وہ اُف نہیں کرتا۔ ناول میں کرداروں کی بہتات ہے جو مختلف طبقوں اور پیشوں سے تعلق رکھتے ہیں جن کے تصادم سے مختلف قسم کے مسائل سامنے آتے ہیں۔ ناول میں ہندستانی سماج کے تمام گوشے نظر آتے ہیں۔ ایک طرف سورداس کے ساتھ غریب اور محنت کش طبقہ ہے اور دوسری طرف جان سیوک جیسے سرمایہ دارانہ ذہنیت اور دولت کے لالچی ہیں۔ کلارک اور براؤن کے ذریعے انگریزی سلطنت کے جبر، انگریزوں کی عیش پرستی اور ہندستانیوں کے ساتھ ان کے غیر انسانی سلوک کو پیش کیا گیا ہے۔ راجہ بھرت، راجہ مہندر کمار اور رانی جاگیردارانہ نظام کی ترجمانی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ صوفیہ، ونے اور اندو سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ طبقے سے تعلق رکھتے ہیں مگر وہ تعلیم یافتہ متوسط طبقے کی ترجمانی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

''چوگانِ ہستی'' میں پریم چند کا فن اپنے عروج پر نظر آتا ہے۔ ناول کی کتابت و طباعت عمدہ اور دیدہ زیب ہے اور امید ہے کہ قارئین کو ضرور پسند آئے گا۔

•

زبان اور قواعد / رشید حسن خاں

صفحات: 503، قیمت: 120/- روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1

آر. کے. پورم، نئی دہلی-67

مبصر: ریاض الدین

زیرِ تبصرہ کتاب اردو زبان و قواعد سے متعلق جناب رشید حسن خاں کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جو مختلف اوقات میں لکھے گئے ہیں اور جنھیں نظرِ ثانی کے بعد اس کتاب میں شامل کیا گیا ہے۔ کتاب میں کل نو مضامین ہیں۔

کتاب کا پہلا مضمون ''صحتِ الفاظ'' پر ہے۔ اس موضوع پر اردو میں بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ بعض لوگوں کی رائے میں عربی و فارسی کے الفاظ کو جہاں تک ہو سکے اسی طرح استعمال کرنا چاہیے جس طرح وہ ان زبانوں کے لغات میں محفوظ ہیں۔ رشید حسن خاں اس سے متفق نہیں۔ ان کے مطابق فارسی اور عربی کے جن لفظوں میں حرکات کی تبدیلی ہوئی ہے یا ان کی صورت بدل گئی ہے یا ان کے معنی میں فرق پیدا ہو گیا ہو تو یہ ساری تبدیلیاں اردو کے مزاج اور ہندستانی لہجے کے اقتضا سے خود بہ خود عمل میں آئی ہیں اور یہ عمل تو زبان کی حقیقی صلاحیت کا مظہر ہوتا ہے۔ جس زبان میں یہ صلاحیت موجود نہیں رہتی، وہ ترقی کے امکانات سے محروم ہو جاتی ہے۔ فاضل مصنف نے ایسے بہت سے فارسی و عربی الفاظ کی نشاندہی بھی کی ہے جو اردو میں آ کر اردو ہی کے سانچے میں ڈھل چکے ہیں، ان کے معنی و مفہوم بھی بدل

گئے ہیں اور کئی صورتوں میں تلفظ بھی۔ انھوں نے بعد کے حوالے سے یہ بحث اُٹھائی ہے کہ لغت کی کتابوں میں باہم اختلاف پائے جاتے ہیں جو ایک پریشان کن صورت ہے۔ ایک صحیح لغت کو کس انداز سے مرتب کیا جائے۔ اس کے لیے انھوں نے گراں قدر مشورے دیے ہیں۔

دوسرا مضمون ''مشترک الفاظ'' ہے۔ یہاں مشترک الفاظ سے مراد وہ الفاظ ہیں جن کی تذکیر و تانیث میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ یہ اختلاف کئی طرح کے ہیں۔ کچھ الفاظ تو دہلی اور لکھنؤ کے دبستانی اختلاف کے تحت آئے ہیں اور کچھ لفظوں کی صورت یہ ہے کہ ایک ہی دبستان کے کچھ لوگ مذکر استعمال کرتے ہیں تو کچھ مونث۔ موصوف نے ماہرین زبان اور شعرا کے اشعار کے حوالے سے صحیح نتیجہ اخذ کرنے کی کوشش کی ہے۔ تیسرا مضمون ''لغت اور استعمال عام'' ہے۔ اردو بہت سی زبانوں کے لفظوں کا مجموعہ ہے، جس میں عربی اور فارسی کے الفاظ کی کثرت ہے۔ جن میں بہت سے الفاظ کو یہاں کے تقاضوں کے تحت تصرفات سے دوچار ہونا پڑا ہے اور یہ ہونا ہی تھا کیونکہ ہر زبان کا مزاج اور لہجہ مختلف ہوتا ہے۔ موصوف نے اختصار کے ساتھ تلفظ کے تغیرات کا جائزہ لیا ہے اور لفظوں کے صحیح تلفظ کا تعین کیا ہے۔ نیز اعراب کی تبدیلی پر بھی بحث کی ہے۔

چوتھا مضمون ''ملائی بالائی'' عنوان کے تحت ہے۔ اس باب میں ملائی اور بالائی کے استعمال سے بحث کی گئی ہے اور اس کے لیے دبستان لکھنؤ اور دبستان دہلی سے مثالیں دی گئی ہیں۔ موصوف کی تحقیق یہ ہے کہ اصل لفظ ملائی ہی ہے، لفظ بالائی لکھنؤ میں نواب سعادت علی خاں کے زمانے میں معرض وجود میں آیا۔ موصوف نے فرہنگ آصفیہ کا حوالہ دیا ہے کہ نواب سعادت علی خاں نے ہی ملائی کا نام بالائی رکھا تھا۔ اب یہ لفظ لکھنؤ میں عام ہے۔ جبکہ دہلی میں کم رائج ہے۔ رشید حسن خاں کا خیال ہے کہ دونوں لفظ صحیح اور فصیح ہیں۔ جو جیسے چاہے استعمال کرے۔ پانچواں مضمون ''ترکیب مہند'' ہے۔ ایسے الفاظ جو دوسری زبانوں سے لیے گئے ہوں اور جن میں تصرف کرکے اردو والوں نے اپنا لیا ہو، مہند کہے جاتے ہیں۔ یہ مضمون تین ذیلی عنوانات پر مشتمل ہے۔ پہلے میں لفظ مہند اور ترکیب مہند کے مفہوم پر بحث کی گئی ہے۔ دوسرے میں فارسی و اردو میں مرکبات کے متعلقہ مسائل کو زیر بحث لایا گیا ہے اور تیسرے میں اردو میں مہند ترکیبوں کے لیے ضروری قاعدے لکھے گئے ہیں اور یہ وضاحت کی گئی ہے کہ کن صورتوں میں ترکیبیں مستحسن ہیں اور کن صورتوں میں غیر مستحسن۔

چھٹا مضمون ''سقوط حرف علت'' ہے۔ زبان کے استعمال میں لہجے کی بہت اہمیت ہوتی ہے اور اس کے تقاضوں کے تحت آواز میں اُتار چڑھاؤ ہوتا ہے۔ لفظوں کی صحیح ترتیب کی بھی بنیادی حیثیت ہے۔ آواز کے اُتار چڑھاؤ میں حروف علت کا سہارا لینا پڑتا ہے اور جس کی وجہ سے آواز میں کشش اور رعنائی پیدا ہو جاتی ہے۔ خصوصاً اشعار میں کہیں حروف علت کو واضح کرکے پڑھتے ہیں اور کہیں پر ساقط کرکے۔ اس کے لیے مصنف نے بہت ساری مثالیں پیش کی ہیں۔ ساتواں مضمون ''اعلان نون'' ہے۔ اس میں نون کے استعمال پر تفصیلی گفتگو کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ عربی فارسی کے وہ الفاظ جن کے آخر میں نون ہو اور اس سے پہلے حروف علت میں سے کوئی حرف ساکن ہو تو ایسے لفظوں کو اشعار میں کس طرح استعمال کیا جائے۔ اگر نون کے اعلان سے کلام میں بدمزگی پیدا ہوتی ہے تو وہاں نون کا اعلان غلط ہوگا، اور یہ بدمزگی اخفائے نون سے بھی پیدا ہو سکتی ہے۔ اس لیے مصنف کے مطابق ایسا کوئی قاعدہ نہیں بنایا جاسکتا، جس کے تحت حتمی طور پر یہ کہا جاسکے کہ نون کا اعلان یا اخفا صحیح ہے یا غلط۔ آٹھواں مضمون ''مختارات امیر مینائی'' ہے۔ اردو شاعری کا وہ دور جو ناسخ سے شروع ہوکر امیر مینائی اور جلال تک جاتا ہے، اس دور میں زبان و بیان، تذکیر و تانیث اور تلفظ کے جھگڑے زیادہ کھڑے ہوئے تھے۔ جن کا احاطہ مصنف نے بڑی خوبی سے کیا ہے، نیز دبستان دہلی اور دبستان لکھنؤ کے پرانے جھگڑے پر بھی گفتگو کی ہے۔ دہلی میں قواعد شاعری کی تفصیلات مرتب نہ ہونے کے اسباب پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

آخری مضمون کا عنوان ''بحرالبیان'' ہے، جو ناسخ کے ایک ممتاز شاگرد بحر لکھنوی کے رسالے کا نام ہے۔ یہ قواعد اور لغت کے موضوع سے تعلق رکھتا ہے۔ بقول رشید حسن خاں اردو میں یہ اپنے انداز کا پہلا رسالہ ہے۔ لیکن موصوف نے یہ وضاحت بھی کردی ہے کہ مصدروں کی تعداد کے لحاظ سے یہ رسالہ ''جامع'' نہیں ہے۔ مصنف نے بحر لکھنوی کے حالات زندگی پر بھی روشنی ڈالی ہے اور مذکورہ رسالے کے مندرجات سے تفصیلی بحث کی ہے۔ بحر لکھنوی کا زمانہ قواعد زبان اور قواعد شاعری سے متعلق یقیناً بحث و مباحثے کا زمانہ تھا۔ یہ مضمون اس زمانے کے ادبی مباحث پر کام کرنے والوں کے لیے خصوصاً کارآمد ہے۔

زبان و قواعد کے موضوع پر اور بھی کئی کتابیں لکھی گئی ہیں لیکن ان سب میں زیر تبصرہ کتاب انفرادی حیثیت رکھتی ہے۔ اس سے نہ صرف طلبہ بلکہ اساتذہ بھی استفادہ کرسکتے ہیں۔ اس بے حد اہم کتاب کی اشاعت کے لیے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان لائق ستائش ہے۔

•

دھوپ چولھا/ایم.ایم.ہدیٰ

صفحات:-100، قیمت:-/38 روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1

آر.کے. پورم، نئی دہلی-67

مبصر: ایس.اے.رحمن

غذا انسان کی بنیادی ضرورت ہے۔ مزیدار اور صحت بخش غذائیں انسان

مختلف وسائل سے حاصل کرتا ہے،جن میں سے بیشتر کو پکا کر استعمال کیا جاتا ہے۔ پکانا ایک عمل ہے جس کے لیے کچھ اشیا لازمی ہوتی ہیں، جیسے برتن، پانی، مسالے اور آگ وغیرہ۔ آگ کا شمار توانائی میں ہوتا ہے اور یہ کھانا پکانے کی اساس ہوتی ہے۔ آگ لکڑی جلا کر ملتی ہے۔ لکڑی سے ہی کوئلہ حاصل ہوتا ہے اور اب پریشر گیس بھی استعمال ہونے لگی ہے لیکن کسی بھی شے کا زیادہ استعمال اس شے کے خاتمے کا اشارہ ہوتا ہے۔ اسی لیے کتاب کے دیباچے میں کہا گیا ہے'' دورِحاضر میں توانائی کا بحران ہم کو مجبور کر رہا ہے کہ ہم پھر قدرتی وسائل کی طرف متوجہ ہوں (اور چونکہ) سب سے زیادہ مقدار میں پائی جانے والی اور تمام توانائیوں کی بنیاد شمسی توانائی ہے تو اس کے استعمال کے طریقے معلوم کر کے بہت سے مسائل حل کیے جاسکتے ہیں۔''

یہ کتاب ایک رہنما کتاب کہی جاسکتی ہے چونکہ اس میں ایسا چولھا بنانا سکھایا گیا ہے جس کے ذریعے شمسی توانائی کا فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔ چولھا ہر گھر میں جلتا ہے، اب اگر ایسا چولھا جلے جس سے نہ گیس لیک ہونے کا خطرہ ہو، نہ سیلنڈر پھٹنے کا، نہ لکڑی کی آگ کے شعلے بھڑکنے کا، نہ گھر میں دھواں بھرنے کا تو ایسے چولھے کو سب ہی پسند کریں گے۔ اور ایسا دھوپ چولھا ہی ہوسکتا ہے۔ اس کتاب میں شمسی توانائی کے حصول کے طریقے بتائے گئے ہیں۔ اس توانائی سے کھانا کیسے پکایا جائے، یہ ٹیکنالوجی بھی بتائی گئی ہے۔ شمسی چولھوں کی ساخت اور ڈیزائن کے اصول بھی بتائے گئے ہیں۔ بناوٹ کی تفصیلات کے ساتھ قیمتوں کا تعین بھی دیا گیا ہے۔ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ایسے چولھوں پر کون سا کھانا کتنی دیر میں پکے گا۔ غرض اپنے موضوع پر یہ ایک اچھی کتاب ہے، جس کا اردو ترجمہ ڈاکٹر خلیل اللہ خاں نے کیا ہے۔ جو اردو داں شمسی توانائی سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں ان کے لیے یہ کتاب خاص طور سے مفید ہے۔

•

شہر آشوب/ اقبال متین

صفحات:272، قیمت:-/150روپے
ناشر: کونج پبلی کیشنز، نظام آباد (آندھرا پردیش)
مبصر: ڈاکٹر قمر رئیس

اب سے کوئی اٹھاون سال پہلے جون 1945 میں ''ادب لطیف'' لاہور میں اقبال متین کی پہلی کہانی شائع ہوئی تھی۔ اس کے بعد ایک مختصر وقفے کو چھوڑ کر وہ پورے انہماک کے ساتھ لکھ رہے ہیں۔ لیکن وہ بسیار نویسی کی طرف کبھی مائل نہیں ہوئے۔ اس دوران قومی زندگی کے جھلکوں اور طوفانوں کے علاوہ کئی طرح کی ذہنی اور ادبی تحریکیں، ان کے سماجی شعور اور تخلیقی احساس پر اثر انداز ہوتی رہیں۔ ان کے وجود میں باطنی اور بیرونی سطح پر گہرے نقش و نگار بناتی رہیں۔ رومانوی فکر و احساس کا پھیلاؤ، نفسیاتی ژرف بینی اور اس سے بڑھ کر انسان کی سماجی زندگی کے المناک حقائق کا ادراک ان کو انسان دوستی کے ارفع افکار اور آدرشوں تک لے گیا۔

اس عرصے میں ان کا ایک ناول'' چراغ تہ داماں'' اور افسانوں کے سات مجموعے شائع ہوئے۔ خاکوں کا ایک مجموعہ'' سوندھی مٹی کے بت'' کے نام سے شائع ہوا۔ جس میں مخدوم محی الدین اور سلیمان ادیب جیسی ممتاز شخصیتوں کے بارے میں تفصیلی مضامین بھی شامل ہیں۔ ناول میں اقبال متین نے ہم جنسی کے موضوع کو جو ہمیشہ متنازعہ رہا ہے، نہایت محتاط انداز میں لیکن تخلیقی حسن کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اسی لیے اردو فکشن میں اس ناول کی ایک الگ شناخت بن گئی ہے۔

اقبال متین کو ایک حقیقت پسند افسانہ نگار کہا گیا ہے۔ خارجی زندگی کی جو حقیقتیں اسے متاثر کرتی ہیں وہ انسانی صورت حال اور انسان کے بنتے بگڑتے مقدر سے گہرا رشتہ رکھتی ہیں اور یہی وہ محرک ہے جو انسانی جذبات اور جسم و جاں کے ہر حصے میں اسے معروضی مشاہدے اور غور و خوض کی دعوت دیتا ہے۔

'شہر آشوب' اقبال متین کے تیرہ افسانوں اور ایک یک بابی تمثیل پر مشتمل ہے۔ ان کہانیوں کے موضوعات اور ان کی ساخت اور اسالیب ان کے پچھلے دور کے افسانوں کی توسیع ضرور ہیں لیکن ایک بڑا فرق بھی ہے۔ کم و بیش ان تمام تخلیقات میں حزن و یاس، احساس جبر و محرومی اور اس سے زیادہ بے چارگی، لاحاصلی اور وحشت ناکی کی فضا نظر آتی ہے۔ یہ عناصر الگ الگ کہانیوں میں ابھرتے اور ڈوبتے ہیں۔ یہ کہانیاں بھی اقبال متین کی دوسری کہانیوں کی طرح متوسط یا نچلے متوسط طبقے کی زندگی کو پیش کرتی ہیں۔ ان کی خستہ حالی، محرومیاں، ٹوٹتے بکھرتے رشتے، تہذیب کے خیموں کی ٹوٹتی طنابیں، بڑھتی حیوانیت، ناآسودگی، انسانی قدروں پر بے اعتمادی اور سب سے بڑھ کر فسادات کے سلسلوں کی درازی اور اس کے نتیجے میں اقلیتی گروہ کے انسانوں میں عدم تحفظ کا شدید اور المناک احساس شہر آشوب اور اونچ نیچ جیسی کہانیوں میں فساد کی بہیمیت، دہشت اور قتل و خون سے پیدا ہونے والا کرب قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ اس لیے کہ یہ ایسی آگ ہے جس میں سارے مہکتے ہوئے جذبے اور معصوم انسانی رشتے جل کر بھسم ہو جاتے ہیں۔ اس کی اتھل پتھل دیکھیے۔

'' ساری آدمیت چوہے کی طرح بلوں میں دبکی بیٹھی ہے، چھپے ہوئے خنجروں نے جنھیں کاٹ دیا ہے۔ تھوڑی سی دیر میں وہ تباہی مچی ہے کہ آدمی کی درندگی پر شرم آنے لگی ہے۔ غذا مہنگی ہے۔ خون ارزاں ہے۔ انسانی خون گلی کوچوں میں ضائع ہوسکتا ہے لیکن گیہوں کے دانے کے لیے بچے بلک رہے ہیں۔۔۔''

" تارتار" میں ایک بچی کی موت کا المیہ احساس انسانی وجود کو کھوکھلا کر دیتا ہے۔ " عجیب اداسی تھی جو مسلط ہو کر رہ گئی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا، کوئی بنیادی سچائی ہے ہی نہیں جو کچھ ہیں حالات ہیں۔ آدمی ایک ایسا کھلونا ہے جس کی مٹی حالات کی چکی میں پستی ہے۔ وقت اسے چھانتا ہے۔ مجبوریاں یا مختاریاں اسے خمیر دیتی ہیں اور جو پہلا سانس لیتا ہے، وہ خدا کے پاس سے صرف اپنی صورت لے کر آتا ہے اور یہ صورت جو اپنی اندرونی اور بیرونی دنیاؤں سے میل کھا کر تشکیل پاتی ہے تو اس وقت خدا کہیں نہیں ہوتا۔"

مجموعے کے ایک طویل مختصر افسانے " آنگن میں سہاگن" میں بیانیہ کا ایک عجیب تجربہ ہے۔ کہانی کا مرکزی کردار ایک نوعمر، نوبیاہتا لڑکی ہے۔ کہانی آپ بیتی کے انداز میں شروع ہوتی ہے لیکن درمیان میں بڑی خاموشی سے افسانہ نگار راوی بن کر قصے کی کڑیوں کو جوڑتا ہے اور قاری کے تجسس کو تسکین دیتا اور کہیں بڑھاتا ہے۔ یہ ممبئی شہر کے نچلے طبقے کی ویرانی، بے حسی، بے مائگی اور حیوانی سطح پر جینے کی کہانی ہے۔ جو دربے جیسی کھولیوں میں رہتے ہیں۔ پوری کہانی، انسانی حرمت، انسانی وقار اور اس کی سہانی خواہشوں اور خوابوں کی المناک موت کے سوگ میں ڈوبی ہوئی نظر آتی ہے۔

اقبال متین کی کہانیاں انسانی دکھ درد کے رشتوں سے، دکھ درد سے گوندھی ہوئی حکایتیں ہیں۔ " ہمزاد" جیسی کہانیوں میں بھی جو دھندلے اور بے نام سے کردار ہیں یا " ڈور تھمی" میں فردول اور نمک دی جیسے کردار جن کا جذباتی وجود حالات کی تپتی ہواؤں میں پگھلتا نظر آتا ہے، یہ سب پرچھائیوں کے ہیولے نہیں ہیں۔ یہ آج کی پرآشوب زندگی کے کینوس پر اتاری ہوئی ایسی بے لاگ تصویریں ہیں جو اپنی کربناکی سے قاری کے دل کو خون کر دیتی ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ شوخ رنگوں میں زندگی اور فطرت کی مصوری آسان ہوتی ہے لیکن پانی جیسے ہلکے کم نما رنگوں میں زندگی کی سچائیوں کی پیکر تراشی مشکل، بہت مشکل ہوتی ہے۔ اس کے لیے ماہرِ فن مصور کا موقلم درکار ہوتا ہے۔ اقبال متین کی کہانیوں میں اسی بے مثل مہارت کا احساس ہوتا ہے۔

•

اردو اخبارات وجرائد کی ڈائرکٹری (انگریزی میں)

مولفہ: مودود علی صدیقی

صفحات: 432، قیمت: -/300 روپے

ناشر: آل انڈیا اردو ایڈیٹرس کانفرنس، 173 کوچہ دکنی رائے، دریا گنج، نئی دہلی-2

مبصر: اطہر فاروقی

آزاد ہندستان میں اردو صحافت کا سرد وگرم چشیدہ اور اس کے اتار چڑھاؤ سے واقف مودود صدیقی جیسا دوسرا کوئی شخص شاید ہی ملے۔ خصوصاً دہلی کی اردو صحافت سے ان کا بہت قریب کا تعلق رہا ہے۔ یہ خوشی کی بات ہے کہ اردو صحافت سے متعلق اپنا حافظہ تحریری شکل میں نئی نسلوں کو منتقل کرنے کے لیے آل انڈیا اردو ایڈیٹرس کانفرنس کے زیرِ اہتمام (جو دہلی میں ہفت روزہ اردو صحافت کے ایک اہم ستون جناب محمد افضل کی زیرِ سرپرستی اپنے لیے وسیع تر جولان گاہیں تلاش کر رہی ہے) مودود صاحب نے بقول شاعر یوں کیا

السلام اے بعدِ ما آئندگانِ رفتنی

زیرِ تبصرہ ڈائرکٹری اردو میں شائع ہونے والے اخبارات و جرائد سے متعلق وہ تمام ضروری معلومات فراہم کراتی ہے جس کی ضرورت اردو اخبارات سے دلچسپی رکھنے والے کسی بھی شخص کو کسی بھی وقت پڑ سکتی ہے۔ بعض صورتوں میں ڈائرکٹری میں ملک کے مختلف گوشوں سے شائع ہونے والے روزانہ، ہفت روزہ اور پندرہ روزہ اخبارات، ماہانہ، دو ماہی اور سہ ماہی رسائل و جرائد سے متعلق تمام ضروری تفصیلات دی گئی ہیں۔ مثلاً اخبار یا رسالے کی قیمت، سن آغاز، مالک، ایڈیٹر، پرنٹر اور پبلشر، پتہ، اشتہارات کا نرخ، اخبار یا رسالے کا سائز، پرنٹ ایریا، طباعت کی قسم اور سرکولیشن وغیرہ۔ اخبارات و رسائل کی یہ ڈائرکٹری حروفِ تہجی کے اعتبار سے مرتب کی گئی ہے تاکہ مطلوبہ جانکاری حاصل کرنے میں آسانی ہو۔ جن اخبارات و رسائل سے متعلق تفصیلات فراہم نہیں ہو سکی ہیں، ایک الگ باب کے تحت ان کا نام اور مقامِ اشاعت دے دیا گیا ہے۔

ڈائرکٹری میں رجسٹرار آف نیوز پیپرس آف انڈیا کے تحت درج تمام اخبارات و رسائل کی تعداد ریاست کے اعتبار سے دی گئی ہے۔ اس کے علاوہ اردو اخبارات سے متعلق آر این آئی کی رپورٹ، مختلف نیوز ایجنسیوں کے نام اور پتے، اردو اکادمیوں کے پتے، آڈٹ بیورو آف سرکولیشن کے ممبر اردو اخبارات، اردو نیوز فیچر ایجنسیوں کے پتے، اخبارات کے رجسٹریشن سے متعلق اطلاعات، رجسٹریشن کے لیے دی جانے والی درخواست کا پروفارما، اس کے لیے ضروری دستاویزات، تصدیق نامہ کا پروفارما وغیرہ بھی اس میں دیے گئے ہیں۔

یہ ڈائرکٹری بنیادی اہمیت کی حامل ہے اور اردو صحافت سے متعلق تمام تفصیلات کا احاطہ کرتی ہے۔ مودود صدیقی صاحب قابلِ مبارکباد ہیں کہ انھوں نے اتنی عرق ریزی سے یہ ڈائرکٹری ترتیب دی اور اسے حوالے کی چیز بنا دیا۔ امید ہے کہ آئندہ ایڈیشن میں وہ اخبارات و رسائل اور صحافت کی تعلیم دینے والے ادارے بھی اس میں شامل کر لیے جائیں گے جو ڈائرکٹری کی اشاعت کے بعد وجود میں آئے ہیں۔

□□□

بچوں کا گوشہ

تحریر: این. این. مجمدار
ترجمہ: آصف نقوی

زندگی کو سمجھنے اور اسے بہتر بنانے میں اچھا ادب معاون ہوتا ہے اور ساتھ ہی اپنے پڑھنے والوں کو یہ ذہنی تفریح بھی بہم پہنچاتا ہے۔ بڑوں کی طرح بچوں کا بھی یہ حق ہے کہ ان کی ذہنی ضرورتوں کے مطابق انہیں اچھا ادب فراہم کیا جائے جو سبق آموز ہونے کے ساتھ ساتھ دلچسپ بھی ہو تاکہ بچے خوشی خوشی اس کا مطالعہ کریں۔ کونسل نے چلڈرن بک ٹرسٹ کے اشتراک سے بچوں کے لیے بڑی تعداد میں ایسی کتابیں شائع کی ہیں جو اس معیار پر پوری اترتی ہیں۔

ذیل میں قومی اردو کونسل کی شائع کردہ کتاب "کچھ ہندستانی چڑیاں" سے اقتباس پیش کیا جارہا ہے۔

رنگ برنگی چڑیاں ہماری دنیا کی خوبصورتی میں اضافہ بھی کرتی ہیں اور انسانی زندگی کے لیے مفید بھی ہیں۔ اس دلچسپ کتاب میں کچھ ہندستانی چڑیوں مثلاً "گوریّا، کوا، مینا، کبوتر، مرغ، بطخ، توتا، مور، کوئل، مہوکا، کالاتیتر، دھنیش، بگلا، سارس، مرغابی، راج ہنس، چیل اور گدھ وغیرہ کے عادات وخصائل، خوردونوش، رہنے کی جگہ، گھونسلے کی قسم وغیرہ سے متعلق معلومات بہم پہنچائی گئی ہیں۔ کتاب میں چڑیوں کی رنگین تصویریں بھی دی گئی ہیں۔ 56صفحات کی اس کتاب کی قیمت صرف 32روپے ہے۔

گوریّا (Sparrow)

گوریّا ایک عام چڑیا ہے جسے انسانوں کے ساتھ رہنا بہت پسند ہے۔ انسانی آبادی بلکہ گھروں میں آپ کو گوریّا مزے سے گھومتی پھرتی نظر آجائے گی اور سچ پوچھیے تو گوریّاں کبھی کبھی ہمیں کافی پریشان بھی کرتی ہیں۔

گوریّاں ہمیشہ جوڑے میں نظر آتی ہیں۔ ان کے بہت سے جوڑے ایک ساتھ پھدکتے پھرتے ہیں۔ بھورے رنگ کی ان چڑیوں کی پیٹھ اور پروں پر ملے جلے کالے اور سفید دھبے ہوتے ہیں اور سامنے سفید بوٹا ہوتا ہے۔

گوریّا اناج، کیڑے مکوڑے اور چھوٹے اور ملائم پودے سب کھالیتی ہے۔ ہمارے تمھارے گھروں میں پکا ہوا کھانا بھی گوریّوں کو بہت پسند ہے۔

گوریّوں کو جہاں جگہ ملے اپنا گھونسلا بنالیتی ہیں۔ کھڑکی کے اوپر، پردے کے پیچھے، الماری کے اوپر، چھت کے پنکھے پر، کونے کھدروں، روشن دانوں، پرانے سامان کے بیچ میں، ہر جگہ آپ کو گوریّا کا گھونسلا نظر آجائے گا۔

مادہ گوریّا 3 یا 4 انڈے دیتی ہے اور ایک سال میں کئی بار انڈوں سے بچے نکالتی ہے۔

کوّا (Crow)

کوّا دنیا کے ہر حصے میں پایا جاتا ہے۔ جہاں کہیں انسان بستے ہیں وہاں آس پاس کوّے بھی نظر آجاتے ہیں۔ اسے انسان کا پڑوس پسند ہے۔ کوّے دو قسم کے ہوتے ہیں، ایک گھریلو کوّا، دوسرا جنگلی کوّا۔ گھریلو کوّا کالا تو ہوتا ہے مگر اس کی گردن کا رنگ سرمئی ہوتا ہے جبکہ جنگلی کوّا سر سے پیر تک ایک دم کالا ہوتا ہے۔ اس کا جسم بھی گھریلو کوّے کے مقابلے میں ذرا بڑا ہوتا ہے۔

کھانے کے نام پر یوں تو یہ تقریباً سب کچھ کھالیتا ہے مگر جو کچھ ہم آپ کھاتے ہیں وہ اسے بہت پسند آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کوّے دن

بھرانسانی بستیوں کے آس پاس منڈلاتے نظر آتے ہیں۔
رات گزارنے کے لیے کوے کسی الگ تھلگ پیڑ پر جمع ہو جاتے ہیں مگر صبح ہوتے ہی وہیں کائیں کائیں کرتے نظر آئیں گے جہاں پچھلے دن تھے۔
کوا ایک سمجھدار، چوکس بلکہ کافی چالاک پرندہ ہے۔ ہمارے تمھارے گھروں سے کھانے پینے اور کچھ چمکدار چیزوں کو موقع پاتے ہی اٹھالے جانے میں کوے کو بہت مزہ آتا ہے۔ اب چاہے وہ کوئی زیور ہی کیوں نہ ہو۔ بچے کا کھلونا ہو، چمچہ ہو یا صابن کی ٹکیہ۔۔۔لیکن جیسے ہی اسے پتہ چلتا ہے کہ یہ کھانے کی چیز نہیں ہے، وہ اسے چھوڑ دیتا ہے۔ کوا ہر طرح کے خطرے کو بہت جلدی بھانپ لیتا ہے اور کائیں کائیں کر کے دوسرے کوؤں کو بھی چوکنا کر دیتا ہے۔
کسی اونچے پیڑ کی دو شاخوں کے بیچ میں کوا اپنا گھونسلا تنکوں، چھوٹی چھوٹی شاخوں، پروں اور طرح طرح کی دھجیوں سے بناتا ہے۔ کبھی کبھی تو تار بھی گھونسلہ بنانے میں استعمال کر لیتا ہے۔ اس کا گھونسلا باہر سے تو اُوبڑ کھابڑ نظر آتا ہے مگر اندر سے آرام دہ اور صاف ستھرا ہوتا ہے۔
مادہ کوا تین سے پانچ انڈے دیتی ہے۔ انڈوں کا رنگ کچھ نیلاہٹ لیے ہرا ہوتا ہے جس پر بھورے رنگ کے دھبے ہوتے ہیں۔ نر اور مادہ دونوں باری باری انڈوں کو سیتے ہیں اور بچوں کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔

جنگلی کبوتر (Blue Rock Pigeon)

جنگلی کبوتر کھنڈروں اور اونچی شہری عمارتوں کے آس پاس اڑتے نظر آتے ہیں۔ جنگلی کبوتر کا رنگ سرمئی اور کچھ اودا سا ہوتا ہے اور اُس کی گردن پر اودے اور ہرے رنگ کے چمکیلے کا سا نشان ہوتا ہے۔ پروں اور دم پر بھی دو گہرے رنگ کے نشان ہوتے ہیں۔
یہ کبوتر اناج اور چھوٹے سوکھے پھل کھاتے ہیں اور اس لیے عام طور پر وہیں نظر بھی آتے ہیں جہاں یہ چیزیں ہوتی ہیں۔ یہ اپنا گھونسلا کھنڈروں، اونچی عمارتوں اور چٹانوں میں گھاس پھونس، سوکھی ٹہنیوں اور کوڑے کباڑ سے بناتے ہیں۔
مادہ کبوتری دو سفید انڈے دیتی ہے اور نر اور مادہ دونوں انڈے سیتے اور بچوں کی دیکھ بھال بھی مل کر کرتے ہیں۔
کبوتر دوسرے پرندوں سے خاص طور پر اس وجہ سے مختلف ہے کہ کبوتری اپنے گلے میں موجود ایک تھیلی سے دودھ جیسی چیز اپنے بچوں کے منہ میں ڈالتی ہے۔

مور (Peacock)

ہندستان کا قومی پرندہ مور سچ مچ ایک بہت خوبصورت اور شاندار پرندہ ہے۔ رنگ برنگی خوبصورت لمبی دم اس وقت کتنی اچھی لگتی ہے جب یہ اسے ایک پنکھے کی طرح پھیلا کر ناچتا ہے۔ اس کی دُم تقریباً 4 فٹ لمبی ہوتی ہے جس کے پنکھ ہرے رنگ کے ہوتے ہیں اور ان کے بیچ میں نیلے رنگ کی ایک خوبصورت آنکھ جیسی شکل بنی ہوتی ہے جو چاروں طرف ایک سنہرے سے چمکیلے سے گھری ہوتی ہے۔ ہریالی لیے نیلے رنگ کے اس پرندے کے سر پر ایک تاج بھی بنا ہوتا ہے۔
مور کے مقابلے میں مورنی کی دُم بہت چھوٹی ہوتی ہے اور اس کے پر بھی مور جیسے خوبصورت نہیں ہوتے۔ اس کا رنگ بھی مور کے ہرے، نیلے سے الگ، کچھ بھورا پن لیے ہوئے ہوتا ہے۔
مورنی جھاڑیوں کے نیچے زمین پر اپنے مضبوط پیروں سے ایک گڈھا سا کھود کر اس میں کچھ سوکھی ٹہنیاں رکھ کر ایک بھدا سا گھونسلا بنالیتی ہے جس میں جنوری اور اکتوبر کے دوران یہ 3 سے 5 مٹ میلے سفید رنگ کے انڈے دیتی ہے۔
مور اناج، پودوں کی نرم شاخیں، کیڑے مکوڑے، چھپکلی، یہاں تک کہ سانپ بچھو سب کھا جاتا ہے۔ مور انسانی بستیوں کے پاس بھی اپنا بسیرا کرتا ہے۔ اکثر لوگ اس کو آسانی سے پال بھی لیتے ہیں۔

کویل(Koel)

کویل ہندستانی پرندوں میں اپنی سریلی آواز۔۔۔کو،کو،کو، کی وجہ سے بہت مشہور ہے اور شاعروں کا پسندیدہ پرندہ ہے۔ بہار کا موسم آیا اور صبح سے لے کر شام تک کویل کی کو۔کو۔سنائی دینے لگی۔ جہاں سردی شروع ہوئی اور کویل کی آواز غائب۔۔۔اس لیے کہ سردی شروع ہوتے ہی یہ گرم مقامات کی طرف اُڑ جاتی ہے۔

کویل کی ایک سب سے عجیب بات یہ ہے کہ یہ کبھی اپنا گھونسلا نہیں بناتی۔ اپریل سے اگست کے دوران مادہ کویل کوّے کے گھونسلے کی تلاش میں رہتی ہے اور موقع پاتے ہی وہاں انڈے دے دیتی ہے اور کوّی بیچاری اس لیے دھوکا کھا جاتی ہے کہ کویل کے انڈے بھی کوّے کے انڈے جیسے پھیکے سرمئی رنگ کے ہوتے ہیں اور ان پر پڑے ہوئے بھورے دھبّے بھی بالکل ایک جیسے لگتے ہیں۔ کوّی نہ صرف کویل کے بچے نکالتی ہے بلکہ اپنے بچوں کے ساتھ ساتھ ان کے منہ میں بھی دانا ڈالتی ہے۔

نر کویل چمکدار کالے رنگ کا ہوتا ہے اور اس کی آنکھوں کے چاروں طرف پیلے ہرے رنگ کا ایک چھلّا سا بنا ہوتا ہے۔ مادہ کویل اپنے نر سے بالکل مختلف بھورے رنگ کی ہوتی ہے اور اس کے جسم پر سفید دھاریاں اور دھبّے ہوتے ہیں۔

کویل کو بڑے بڑے خوب گھنے پیڑوں پر رہنا پسند ہے۔ ہندستان میں ہر جگہ کویل نظر آ جاتی ہے۔

کویل کی غذا پھل کیڑے مکوڑے، خاص طور پر کیٹر پلر ہوتے ہیں۔

مہوکا/کوکا(Crow Pheasant)

مہوکا ایک کالے رنگ کی چڑیا ہے، جس کے پر کتھئی رنگ کے ہوتے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی جھاڑیوں میں کودتی پھدکتی یہ چڑیا کبھی کبھی اڑ کر پیڑ پر بھی بیٹھ جاتی ہے ورنہ زیادہ تر تو یہ زمین اور جھاڑیوں کی جڑوں سے کیڑے مکوڑے چننے میں مست رہتی ہے۔ کبھی کبھی یہ چھپکلی، گرگٹ، چھوٹی چوہیا، چڑیوں کے انڈے اور بچے سب کھا جاتی ہے۔

مہوکا کانٹے دار جھاڑیوں میں یا کسی چھوٹے پیڑ کی نچلی شاخوں میں ایک اوبڑ کھابڑ بڑا سا گھونسلہ بناتی ہے۔ اس کی مادہ عام طور پر فروری اور ستمبر کے دوران 3 یا 4 مٹ میلے سفید رنگ کے انڈے دیتی ہے جن کی دیکھ بھال نر اور مادہ دونوں باری باری کرتے ہیں۔

بگلا(Grey Heron)

اصل میں بگلا ایک پانی کی چڑیا ہے مگر وہ تیر نہیں سکتی، پھر بھی اپنی لمبی لمبی ٹانگوں پر وہ کم گہرے تال تالابوں میں کھڑی ہو سکتی ہے۔ ملے جلے بغیر یہ بہت بہت دیر تک پانی میں کھڑی اپنی مچھلی کے شکار کا انتظار کرتی رہتی ہے۔ کبھی کبھی تو انھیں بالکل اکیلے پانی میں کندھے لٹائے اونگھتے بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

بگلا کے پیر پتلے اور لمبے ہوتے ہیں۔ پیر اور پیٹھ سرمئی رنگ کی ہوتی ہے مگر سر اور گردن سفید ہوتے ہیں۔ اس کی لمبی گردن انگریزی کے حرف (S) کی طرح مڑی تڑی ہوتی ہے۔ بگلے کی گردن پر کالی بندیوں کی ایک لمبی سی لکیر ہوتی ہے اور سر پر دو کالی پنکھڑیاں سی ہوتی ہیں۔ گردن کے سفید چھوٹے چھوٹے پر کچھ اوبڑ کھابڑ ہوتے ہیں اور ان میں کچھ کالے بھی نظر آتے ہیں۔

اپنے گھونسلے کے نام پر پیڑ کے اوپری حصے پر یہ سوکھی ٹہنیوں کو اکٹھا کر کے ایک چبوترہ سا بنا لیتی ہے جس کے بیچوں بیچ ایک گڈھا سا ہوتا ہے۔ ایک ہی پیڑ پر کئی بگلے گھونسلے بنا لیتے ہیں۔

دوسری پانی کی چڑیوں کے ساتھ ساتھ مادہ بگلا بھی نومبر سے مارچ کے دوران تین سے چھ گہرے ہرے رنگ کے انڈے دیتی ہے۔

اڑان کے وقت بگلے اپنی لمبی گردن سکیڑ کر کندھوں کے اندر کر لیتے ہیں اور ان کی لمبی ٹانگیں سب سے پیچھے نظر آتی ہیں۔ □□□

ہریانہ اردو اکیڈمی کی جانب سے 19 ستمبر 2003 کو چھٹے ادبی کوئز مقابلے کا انعقاد ہوا جس کی صدارت ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ نے کی اور مہمان خصوصی جناب گوپی چند گہلوت،
ڈپٹی اسپیکر ہریانہ ودھان سبھا تھے۔ اس موقعے پر جناب گہلوت طلبہ کو انعامات سے نوازتے ہوئے۔ ساتھ میں ہیں ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ اور جناب رمیندر جاکھو ساحل، سکریٹری ہریانہ اردو اکادمی۔

امارت شرعیہ ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر ٹرسٹ، پھلواری شریف، پٹنہ میں قائم قومی اردو کونسل کے کمپیوٹر سینٹر میں 19 ستمبر 2003 کو جلسۂ تقسیم اسناد منعقد ہوا۔
اس موقعے پر لی گئی تصویر میں ڈاکٹر اخلاق الرحمان قدوائی سابق گورنر بہار، سند یافتہ طلبہ کے ساتھ۔

URDU DUNIYA Monthly, January [illegible]
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Secondary & Higher Education, Ministry of H.R.D., Government of India, New Delhi

زندگی کو سمجھنے اور اسے بہتر بنانے میں اچھا ادب معاون ہوتا ہے اور ساتھ ہی اپنے پڑھنے والوں کو یہ ذہنی تفریح بھی بہم پہنچاتا ہے۔ بڑوں کی طرح بچوں کا بھی یہ حق ہے کہ ان کی ذہنی ضرورتوں کے مطابق انھیں اچھا ادب فراہم کیا جائے جو سبق آموز ہونے کے ساتھ ساتھ دلچسپ بھی ہو تاکہ بچے خوشی خوشی اس کا مطالعہ کریں۔ کونسل نے بچوں کے لیے بڑی تعداد میں ایسی کتابیں شائع کی ہیں جو اس معیار پر پوری اترتی ہیں۔

دھوپ چولھا

مصنف: ایم. ایم. ہدی / مترجم: ڈاکٹر خلیل اللہ خاں

[illegible]

صفحات: 100، قیمت: -/38 روپے

کیمیا کی کہانی

مصنف: سید شہاب الدین دسنوی

[illegible]

صفحات: 128، قیمت: -/16 روپے

سائنس کی کہانیاں (حصہ اوّل)

مصنف: بسکف اور سکف / مترجم: ڈاکٹر انیس الدین ملک

[illegible]

صفحات: 152، قیمت: -/18 روپے

عرب کی لوک کہانیاں: ایک تہذیبی ورثہ

مصنف: ڈاکٹر حسن عسکری کاظمی

[illegible]

صفحات: 131، قیمت: [illegible] روپے

نورتن کہانیاں

مصنف: محمد بخش مجبور / انتخاب: شمیم احمد

[illegible]

صفحات: 192، قیمت: -/20 روپے

ایک نائی اور رنگ ساز کا قصہ

مصنف: اطہر پرویز

[illegible]

صفحات: 148، قیمت: -/18 روپے

اَسّی دن میں دنیا کا سفر

مصنف: جولس ورن / مترجم: صفدر حسین

[illegible]

صفحات: 170، قیمت: -/21 روپے

حیوانات کی دلچسپ دنیا

مصنف: محمد خلیل

[illegible]

صفحات: 111، قیمت: -/17 روپے

نوٹ :- طالب علموں اور اساتذہ کے لیے 40 فیصد کی خصوصی رعایت تاجران کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

Printed and Published by Director, NCPUL on behalf of NCPUL, Printed at J.K. Offset Printers, Jama Masjid, Delhi-110006 and Published at NCPUL, West Block-I, Wing-6, R.K. Puram, New Delhi-110 066, Editor Dr. M. Hamidullah Bhat. Tel : 26103381, 26103938